خلافت راشدہ

کا

عہد زرّیں

مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

دار المؤلفین، دیوبند (یوپی، انڈیا)

خلافتِ راشدہ
کا
عہدِ زرّیں

تالیف

مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

ناشر
دار المؤلفین دیوبند
یوپی ـــــ ۲۴۷۵۵۴

سلسلۂ مطبوعاتِ دارالمؤلفین۔ دیوبند
(۱۰)
جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب : خلافتِ راشدہ کا عہد زریں
مصنف : مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی
اشاعت دوم : ۱۹۹۷ء
تعداد : ایک ہزار
قیمت : ساٹھ روپے

ملنے کے پتے :

مکتبہ دارالمؤلفین، دیوبند یوپی

کتب خانہ حسینیہ، دیوبند یوپی

فہرستِ مضامین

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
سخنِ اوّلیں	۹	حالاتِ بعدِ خلافت	۲۸
خلافت	۱۱	لشکرِ اُسامہ کی روانگی	۲۸
خلافت کسے کہتے ہیں؟	۱۲	گراں قدر نصیحتیں	۲۹
انتخاب کیسے ہو؟	۱۳	ظہورِ فتن و فسادات	۳۱
جب شورائی نظام نہ ہو	۱۳	مُدعیانِ نبوت کی سرکوبی	۳۳
عہدِ خلافتِ راشدہ	۱۵	طلیحہ اسدی	۳۴
عہدِ خلافتِ صدّیقی	۱۷	مسیلمۂ کذّاب	۳۴
انتخابِ خلافت	۱۷	اسود عنسی	۳۶
سقیفۂ بنی ساعدہ کا اجتماع	۱۷	مُرتدین اور باغیوں کی سرکوبی	۳۹
انتخابِ ابوبکر صدّیق رضؓ	۱۹	امدادِ غیبی	۴۰
بیعتِ عام	۲۰	مسلمانوں کی حریف طاقتیں	۴۳
حضرتِ علی رضؓ کی تاخیر	۲۱	سلطنتِ فارس	۴۵
حالاتِ قبلِ خلافت	۲۲	سلطنتِ روم	۴۸
سب سے پہلے قبولِ اسلام	۲۲	آغازِ فتوحات	۵۲
مالی قربانیاں	۲۳	مہمّاتِ عراق	۵۲
ابتلاء و مصائب	۲۳	جنگِ کاظمہ	۵۲
خطابِ صدّیقی	۲۴	جنگِ مذار	۵۳
یارِ غار	۲۴	جنگِ ولجہ	۵۳
شرکتِ غزوات	۲۶	جنگِ الیس	۵۳
امارتِ حج	۲۶	فتحِ حیرہ	۵۴
امامتِ مسجدِ نبوی	۲۶		

عنوان	صفحہ
بادشاہ اور اُمرا کے نام خط	۵۴
فتحِ انبار	۵۵
فتحِ عینُ التمر	۵۵
فتحِ دومۃُ الجندل	۵۶
حیرہ کو واپسی	۵۷
جنگِ فراض	۵۷
حجِ بیتُ اللہ	۵۸
حضرت خالد کے کارنامے	۵۸
مہماتِ شام	۶۰
جنگِ یرموک	۶۰
حضرت خالد کی آمد	۶۱
لشکرِ اسلام کی تنظیم	۶۱
مُقابلہ	۶۲
فتح	۶۲
حضرت خالد کی معزولی	۶۳
وفاتِ صدّیقِ اکبرؓ	۶۴
عہدِ خلافت کے کارناموں پر ایک نظر	۶۶
خاندانِ ابوبکر	۶۸
عہدِ خلافتِ فاروقی	۶۹
حالاتِ قبلِ خلافت	۶۹
واقعاتِ عہدِ خلافت	۷۲
فتوحاتِ عراق۔	۷۲

عنوان	صفحہ
رُستم کی آمد	۷۴
معرکۂ نمارق	۷۴
معرکۂ کسکر	۷۵
واقعۂ جسر	۷۶
معرکۂ بُویب	۷۷
یزدگرد کی تخت نشینی	۷۹
سعد بن ابی وقاص کی سپہ سالاری	۸۰
سعد قادسیہ میں	۸۱
اسلامی سفیر دربارِ ایران میں	۸۱
بدفالی	۸۲
سُفرا کا نغرۂ حق	۸۲
رُستم قادسیہ میں	۸۴
ربعی رُستم کے دربار میں	۸۴
جنگِ قادسیہ	۸۷
یومِ ارماث	۸۷
یومِ اغواث	۸۸
ابومحجن کی بے قراری	۸۹
یومِ عماس	۸۹
خلیفہ بھی اسلام کا سپاہی ہے	۹۱
فتحِ کابل	۹۱
فتحِ ہیرہ شہیر	۹۲
مدائن کی فتح	۹۳

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
فتحِ جلولا	۹۵	یزدجرد، خاقان کی پناہ میں	۱۱۶
فتحِ تکریت	۹۷	بقیہ فتوحاتِ شام	۱۱۷
فتحِ موصل	۹۸	فتحِ دمشق	۱۱۷
خراج اور جزیہ	۹۹	حضرت خالد کی جرأتِ مردانہ	۱۱۸
فتحِ ماسبذان	۹۹	معرکۂ مرج الرُّدم	۱۱۹
فتحِ قرقیسا و ہیت	۹۹	فتحِ حمص	۱۲۰
آبادیِ بصرہ و کوفہ	۱۰۱	فتحِ قنسرین	۱۲۰
فتحِ جزیرہ	۱۰۲	حلب	۱۲۱
فتحِ اہواز	۱۰۳	انطاکیہ	۱۲۱
بحرین سے فارس پر حملہ	۱۰۴	مسلمان کیوں کامیاب ہیں؟	۱۲۱
فتحِ رامہرمز و تستر	۱۰۶	قیساریہ	۱۲۳
شاہِ اہواز دربارِ خلافت میں	۱۰۷	معرکۂ اجنادین	۱۲۳
ذمّیوں کا خیال	۱۰۹	فتحِ بیت المقدس	۱۲۵
معرکۂ نہاوند	۱۰۹	طاعون کی بلا	۱۳۰
تسخیرِ ایران	۱۱۱	تیسرا سفرِ شام	۱۳۱
فتحِ اصفہان	۱۱۲	عام الرّمادہ	۱۳۲
فتحِ ہمدان	۱۱۳	فتحِ مصر	۱۳۴
فتحِ واج رود	۱۱۳	فتحِ فرما	۱۳۵
دیگر فتوحات	۱۱۴	فتحِ بلبیس	۱۳۵
فتحِ طبرستان	۱۱۴	فتحِ اُمّ الدنین	۱۳۵
درِ بند کی طرف پیش قدمی	۱۱۴	فتحِ حصنِ بابلیون	۱۳۶
فتحِ کرمان	۱۱۵	وہ قوم جسے موت، زندگی سے زیادہ عزیز ہے	۱۳۶

عنوان	صفحہ
صلح	۱۳۷
فتحِ اسکندریہ	۱۳۷
عروسۂ نیل	۱۳۹
آبادیِ فسطاط	۱۴۰
شہادتِ عمر فاروق رضؓ	۱۴۱
عہدِ خلافت کے کارناموں پر ایک نظر	۱۴۴
خاندانِ عمر فاروق رضؓ	۱۵۰
عہدِ خلافتِ عثمانی	۱۵۱
انتخابِ خلافت	۱۵۱
حالات قبلِ خلافت	۱۵۴
واقعاتِ عہدِ خلافت	۱۵۷
پہلا مقدّمہ	۱۵۷
عُمّالِ عہدِ عثمانی	۱۵۸
گورنروں کو ہدایت نامہ	۱۵۸
فتوحاتِ عہدِ عثمانی	۱۶۰
آذربیجان کی دوبارہ فتح	۱۶۰
بلنجر کی فتح	۱۶۰
خراسان وغیرہ کی دوبارہ فتح	۱۶۱
فتوحاتِ شام	۱۶۲
فتحِ قبرص	۱۶۲
جنگی بیڑہ	۱۶۲
واقعاتِ مصر	۱۶۳

عنوان	صفحہ
فتحِ افریقیہ	۱۶۳
بحری جنگ	۱۶۳
یزدگرد کا قتل	۱۶۵
مفسدوں کی سازش اور انقلاب کی کوشش	۱۶۷
اسبابِ اختلافِ اُمّت	۱۶۷
مخالفانہ تحریک	۱۷۱
عبداللہ ابنِ سبا	۱۷۲
بصرہ و کوفہ	۱۷۳
شام	۱۷۴
مصر	۱۷۶
فتنہ پردازی کی مہم	۱۷۷
عُمّال کی مجلسِ مشاورت	۱۷۸
تحقیقاتی وفود	۱۷۹
مفسدین کے وفود مدینہ منورہ میں	۱۸۰
مفسدین کی مدینہ منورہ روانگی	۱۸۱
گھر کا محاصرہ	۱۸۳
شہادت کی تیاری	۱۸۶
شہادت	۱۸۶
تدفین	۱۸۸
غم کے آنسو	۱۸۸
نتائجِ بد	۱۸۹

عنوان	صفحہ
شیعۂ علی	۱۸۹
خوارج	۱۹۰
شیعۂ عثمان	۱۹۰
اہلِ سُنّت والجماعت	۱۹۰
خاندانِ عثمانِ غنی	۱۹۲
عہدِ خلافت کے کارناموں پر ایک نظر	۱۹۳
حفاظتِ قرآنِ کریم کا انتظام	۱۹۵
عہدِ خلافتِ مرتضوی	۱۹۸
انتخابِ خلافت	۱۹۸
حالات قبلِ خلافت	۲۰۰
واقعاتِ عہدِ خلافت	۲۰۶
معزولیِ حُکّام	۲۰۶
حضرت معاویہ کا انکار	۲۰۷
حضرت عائشہ کی مداخلت	۲۱۰
جنگِ جمل	۲۱۰
حضرت عائشہ بصرہ میں	۲۱۱
حضرت علی بصرہ کو	۲۱۳
مُصالحت کی کوشش	۲۱۴
مُفسدین کی سازش	۲۱۵
حضرت عائشہ میدان میں	۲۱۶
خاتمۂ جنگ	۲۱۷
جنگِ صفین	۲۲۰
قرآن نیزوں پر	۲۲۲
عہد نامۂ تحکیم	۲۲۴
حکمین کا فیصلہ	۲۲۵
حضرت معاویہ کی جیت	۲۲۶
عمرو بن عاص کی سیاست	۲۲۷
ظہورِ خوارج	۲۲۸
ایک نیا فتنہ	۲۲۸
شام کا ارادہ اور اس کا التوا	۲۳۲
اہلِ کوفہ کی بددلی کے اسباب	۲۳۳
حضرت معاویہ کی پیش قدمی	۲۳۵
مصر پر قبضہ	۲۳۵
حجاز و یمن وغیرہ پر حملے	۲۳۷
حضرت علی کی مایوسی	۲۳۸
شہادتِ علی مرتضیٰ	۲۳۹
خاندانِ علی مرتضیٰ	۲۴۲
عہدِ خلافت کے کارناموں پر ایک نظر	۲۴۴
زہد و تقویٰ	۲۴۵
علمی و عملی کمالات	۲۴۷
خطابت و شاعری	۲۴۸
تصوّف	۲۴۸
خلافتِ حضرت حسن	۲۴۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سُخنِ اوّلیں

حمداً و صلاۃً

سیرتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصّلاۃ والسّلام کے بعد سیرتِ صحابہ بالخصوص خُلفائے راشدین پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، اور یہ سلسلہ جاری ہے اور انشاء اللہ جاری رہے گا۔ پیشِ نظر کتاب "خلافتِ راشدہ کا عہدِ زرّیں" بھی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہے، جس کے فاضل مُصنّف حضرت مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجّاد میرٹھی زید مجدہم رُکنِ مجلسِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند ہیں، جن کی علمی اور دینی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ موجودہ عُلمائے دیوبند میں آپ کا شمار اُن چیدہ اور مایۂ ناز افراد میں ہے، جنھیں اللہ نے علم و تقویٰ کے ساتھ بہت سے مومنانہ اوصاف سے نوازا ہے، اور آپ کے حقیقت نگار قلم سے متعدّد قیمتی تصانیف وجود میں آکر مقبول ہو چکی ہیں۔ آپ کا طرزِ نگارش محققانہ اور سلیس و شگفتہ ہونے کے ساتھ، عالمانہ مذاق اور حکیمانہ اسلوب کا حامل ہے۔

پیشِ نظر کتاب بہ طورِ خاص کالجوں میں داخلِ نصاب کرنے کے لیے لکھی گئی ہے۔ وہ مختصر ہونے کے ساتھ، سیرتِ خُلفا کے تمام گوشوں اور دَورِ خلافتِ راشدہ کے تقریباً تمام واقعات کو محیط ہے۔ ہر واقعہ ممکنہ حد تک، علمی اور تاریخی معیار پر پرکھ کر شاملِ کتاب کیا گیا ہے، اور

کوشش کی گئی ہے کہ یہ کتاب غلط اور مشتبہ واقعات اور ضعیف روایات واقوال سے پاک رہے۔ زبان واُسلوب آسان بھی ہے اور معیاری بھی، جس سے انشاء اللہ چھوٹے اور بڑے سبھی دل چسپی کے ساتھ استفادہ کرسکیں گے۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبولِ عام عطا فرمائے، اور جس نیک مقصد کے تحت اس کی تالیف واشاعت ہوئی ہے، اس کی تکمیل کی توفیق دے۔

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيزٍ۔

وَحِيدُ الزَّمَاں قاسمی کیرانوی
اُستاذِ دارالعلوم دیوبند ومعتمد دارالمؤلفین دیوبند
۱۲ ذیقعدہ ۱۴۰۸ھ مطابق ۲۷ جون ۱۹۸۸ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
والصلاۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم

خلافت

اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر، امت کی صلاح و فلاح کے لیے دو اہم ذمہ داریاں عائد کی گئی تھیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کے پیغامِ ہدایت کو جو قرآنِ کریم کی صورت میں اتر رہا تھا حفاظت کے ساتھ امت تک پہنچانا اور اس کے مطالب و مقاصد کو واضح کرنا۔

(۲) اللہ تعالیٰ کے پیغام کو اس کے بندوں کی عملی زندگی میں نافذ کرنا اور احکامِ شریعت کو ان میں جاری کرنا اور دشمنانِ ملت سے ان کی حفاظت کرنا۔

پہلی ذمہ داری بحیثیت اللہ کے رسول کے تھی اور دوسری ذمہ داری بحیثیت امت کے پیشوا اور رہنما کے۔

پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں فرمایا گیا:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعہ ۲)

وہ خدا ہی ہے جس نے اَن پڑھوں میں ایک رسول بھیجا، ان ہی میں سے، جو ان کو اس کی اتاری ہوئی آیتیں پڑھ کر سُناتا ہے اور ان کو نکھارتا ہے اور ان کو قرآن اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى یُحَكِّمُوْكَ

پس قسم ہے تیرے رب کی، وہ ایمان والے

فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝ 4:65 (النساء ۹)

نہیں ہو سکتے جب تک (اے نبی) تم کو اپنے جھگڑوں میں حاکم نہ بنائیں۔ پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس سے تنگ دل نہ ہوں۔ اور تمہاری بات پوری طرح مان لیں۔

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں پہلی ذمہ داری کو بحسن وخوبی ادا کر دیا۔ قرآنِ کریم جو آپ کی زندگی میں پورا اُتر چکا تھا آپ نے اس کے معانی اور مطالب صحابۂ کرام کے سامنے کھول کر بیان کر دیے، بلکہ ایک ایسی جماعت تیار کر دی جو قرآنی تعلیمات کا زندہ نمونہ تھی، مگر دوسری ذمہ داری جو بحیثیت امت کے سردار کے تھی یعنی امت کے دینی امور کی نگرانی، دنیوی معاملات میں ان کی رہنمائی اور دشمنانِ ملت سے ان کی حفاظت اس کی ضرورت باقی رہی، اس ذمہ داری کو خلافت اور امامت کے نام سے تعبیر کیا گیا اور جو اسے قبول کرے اسے خلیفہ اور امام کہا گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم سے پہلے بنی اسرائیل میں نبی اُن کے دینی و دنیوی معاملات کی نگرانی کرتے تھے۔ جب ایک نبی وفات پا جاتا تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا تھا۔ لیکن میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔ آگے تم میں خلیفہ ہوں گے اور بہت سے ہوں گے۔ (بخاری جلد ۱ ص ۴۹۱)

خلافت کسے کہتے ہیں؟

خلافت کے معنیٰ نیابت اور جانشینی کے ہیں۔ خلیفہ پیغمبر خدا کے نائب اور جانشین کی حیثیت سے مسلمانوں کے دینی معاملات کا نگراں اور دنیوی معاملات میں اُن کا رہنما اور دشمنانِ ملت سے اُن کی حفاظت کا ذمہ دار ہوتا ہے[۱]

ظاہر ہے کہ اس بلند منصب پر وہی فائز ہو سکتا ہے جو احکامِ شریعت اور اُن

---

[۱] مقدمہ ابنِ خلدون ص ۱۶۶ طبع مصر

کے ماخذ قرآن وحدیث پر گہری نظر رکھتا ہو اور خود بھی اُن پر عامل ہو۔ صاحبِ عقل وعزم ہو اور اپنے علمی وعملی کمالات کی وجہ سے مسلمانوں میں اس کو عظمت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہو اور اس کو ان کا اعتماد حاصل ہو۔

انتخاب کیسے ہو؟

قرآنِ کریم میں اجتماعی معاملات کو طے کرنے کے لیے مسلمانوں کو یہ طریقہ بتایا گیا ہے کہ:

اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ 42:38 ان کے معاملات باہمی مشورہ سے طے ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا سب سے اہم معاملہ خلیفہ کے انتخاب کا ہے، پیغمبر کے نائب کی حیثیت سے وہی ان کے دینی امور کا نگراں اور دنیوی معاملات کا رہنما ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے انتخاب میں اسی اصول پر عمل کیا جائے گا۔ یعنی مسلمانوں کے ذمہ دار اصحاب اور اگر ممکن ہو تو عام مسلمان، ہر قسم کے دباؤ اور لالچ سے الگ ہو کر پوری دیانت کے ساتھ، موزوں ترین فردِ امت کو اپنا خلیفہ اور امام منتخب کریں گے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا	بے شک اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ
الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا	تم ذمہ داری کے کاموں کو اُن کے
(النساء ۸) 4:58	سپرد کرو جو اسے ادا کرنے کے اہل ہوں

پوری امت کے اجتماعی معاملات کی ذمہ داری سے بڑی ذمہ داری اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس لیے دیانت داری کے ساتھ اسے لائق ترین شخص کے سپرد کرنا ضروری ہے۔

جب شورائی نظام نہ ہو

اصولِ اسلامی کے مطابق انتخابِ خلیفہ اُسی وقت ممکن ہے جب مسلمانوں میں

شورائی نظام اپنی جمہوری روح کے ساتھ باقی ہو۔ اگر یہ نظام نہ ہو، تو پھر انتخاب ممکن نہیں۔ ایسی صورت میں اگر کوئی بھی مسلمان، ملک پر اپنا اقتدار قائم کرلے، خواہ وہ خاندانی اثرات کی بنیاد پر ہو یا اپنی فوجی طاقت کے بل بوتے پر، مسلمتاً اسے سربراہ تسلیم کرلیا جائے گا اور اس کے تمام جائز احکام کی تعمیل بھی ضروری ہوگی۔ اِس حکم کی مصلحت ظاہر ہے۔ اگر اس کے خلاف تلوار اٹھائی جائے گی تو فتنہ و فساد کی آگ بھڑکے گی اور ملت کا شیرازہ منتشر ہوگا۔ ہر گروہ بند شخص اپنے ساتھیوں کو لے کر اٹھ کھڑا ہوگا۔ پھر شورائی نظام تو ٹوٹ پھوٹ چکا، اس کا فیصلہ کس طرح ہوگا کہ کون واقعی مستحق ہے اور کون نہیں؟ آخر زبانِ شمشیر ہی اس کا فیصلہ کرے گی۔ اور جس کی طاقت زیادہ ہوگی وہی حکومت پر قابض ہوجائے گا۔

اِسی صورت کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے جس میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تمہارے بہتر امام وہ ہیں جن سے تم محبت کرتے ہو اور وہ تم سے محبت کرتے ہیں۔ تم اُن کے لیے رحمت کی دعا مانگتے ہو، وہ تمہارے لیے رحمت کی دعا مانگتے ہیں۔ اور تم میں بدتر امام وہ ہیں جنھیں تم دشمن سمجھتے ہو اور وہ تمہیں دشمن سمجھتے ہیں۔ تم اُن پر لعنت بھیجتے ہو اور وہ تم پر۔ راوی نے کہا: ہم صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس صورت میں کیا ایسے بادشاہوں سے ہم نہ لڑیں؟ آپ نے فرمایا نہیں، جب تک وہ تم میں نماز قائم رکھیں (اطاعت ہی کرو) ہاں، جو شخص اپنے حاکم کی کوئی گناہ کی بات دیکھے تو اس گناہ کی بات کرنے کو بُرا سمجھے مگر اس کی اطاعت سے باہر نہ ہو۔"[1]

بدقسمتی سے خلافتِ راشدہ کے بعد مسلمانوں میں شورائی نظام باقی نہ رہا، اِسی لیے اگرچہ بعد میں بھی اصحابِ حکومت خلیفہ یا امام کہلاتے رہے مگر دراصل

---

[1] مسلم بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۱۹

وہ بادشاہ تھے۔ امت کے منتخب نمائندے نہ تھے۔ اُن میں سے بعض ذاتی طور پر نیک اور دیندار اور ملت کے ہمدرد تھے۔ اور اکثر مطلق العنان، خود غرض اور عیش پسند۔ تاہم اُن کے اچھے احکام کی تعمیل کی جاتی رہی اور علماء اور بزرگانِ دین نے ان کے ساتھ امورِ خیر میں تعاون بھی کیا۔ اور ان کے بُرے کاموں کو برا سمجھا جاتا رہا۔ اور بعض ارباب عزیمت نے کھُل کر ان کی بُری باتوں کا انکار کیا اور اس راستہ میں سخت تکلیفیں برداشت کیں۔

عہدِ خلافتِ راشدہ

مسلمان اصولِ مذکورہ کے مطابق، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد، باہمی مشورہ سے بہترین فردِ امت کو خلیفہ منتخب کرتے رہے۔ چنانچہ اس طرح یہ چار بزرگ یکے بعد دیگرے خلیفہ منتخب ہوئے:

حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمانِ غنی اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

ان بزرگوں نے پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کی ذمہ داریوں کو بہترین طریقہ پر پورا کیا۔ اپنے اپنے زمانہ میں عزم و ہمت کے ساتھ احکامِ اسلام کو جاری کیا۔ طاقت وروں سے کمزوروں کو اُن کا حق دلایا۔ دشمنانِ اسلام سے جہاد کیا اور اللہ کی زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیا اور دنیا کو امن و امان کا گہوارہ بنا دیا۔

اس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہوا:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور
مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	انھوں نے نیک عمل کیے اُن سے
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ	اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ انھیں وہ
كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ	زمین کی خلافت دے گا جس طرح

وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي	اُس نے ان سے پہلے لوگوں کو دی اور ان
ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ	کے لیے اُن کے خدا کا پسندیدہ دین مضبوط
مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا	کر دے گا اور ان کے خوف کے دنوں کو
(النور ۵۵)	امن کے زمانہ سے بدل دے گا۔

ان کا دورِ حکومت "خلافتِ راشدہ" کہلایا، کیوں کہ یہ عہدِ نبوت کا صحیح نمونہ تھا۔

مگر افسوس کہ یہ مبارک زمانہ، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق کہ:

اَلْخِلَافَةُ بَعْدِي ثَلَاثُونَ	میرے بعد خلافت (نبوت کے طریقہ پر)
عَامًا ثُمَّ مُلْكٌ بَعْدَ ذٰلِكَ۔	تیس سال ہے پھر اس کے بعد بادشاہت ہے

۱۱ھ سے شروع ہو کر ۴۰ھ میں خلیفۂ چہارم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت پر ختم ہو گیا۔

عہدِ خلافتِ صدّیقی

انتخابِ خلافت

رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال کی خبر سُن کر مسلمان حیران و پریشان رہ گئے۔ بعض تو اس بات کو ماننے کے لیے ہی تیار نہ ہوئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی وفات ہو سکتی ہے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق تلوار کھینچ کے کھڑے ہو گئے کہ جو شخص یہ کہے گا کہ حضور کی وفات ہو گئی ہے، اس کی گردن اُڑا دوں گا۔

مگر جب ہوش و حواس درست ہوئے اور حضرت ابو بکر رضؓ نے قرآنِ کریم کی آیتیں پڑھ کر سنائیں تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑا۔ اور یہ مسئلہ سامنے آیا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین کون ہو جس کی سربراہی میں مسلمانوں کی جماعتی زندگی کا شیرازہ بندھا رہے اور جس کی زیرِ قیادت وہ اسلام کی روشنی ساری دنیا میں پھیلا سکیں۔

سقیفہ بنی ساعدہ کا اجتماع

ادھر منافقین بھی اپنی سازشوں میں لگے ہوئے تھے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین تیسرے روز ہوئی۔ مگر اس سے پہلے ہی، انصارِ مدینہ کے سردار سعد بن عبادہ کی نشست گاہ سقیفہ بنی ساعدہ میں، خلیفۂ رسول اللہ کے انتخاب کا مسئلہ چھیڑ دیا گیا، اور سعد بن عبادہ کا نام خلافت کے منصب کے لیے پیش کر دیا گیا۔

حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراح وغیرہ اکابر مہاجرین کو اس اجتماع کی خبر ملی تو مسئلہ کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے وہ بھی اس اجتماع میں تشریف لے آئے۔ حضرت ابوبکر رضؓ نے فرمایا:

ہم مہاجرین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احباب اور آپ کے اہلِ خاندان ہیں، خلافتِ رسول کے سب سے زیادہ حقدار ہم ہیں۔ کسی کو اس معاملہ میں ہم سے نزاع کا حق نہیں ہے۔ مگر انصار نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی مدد کی ہے، اور اسلام کی غربت کے زمانہ میں اس کی بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ اس لیے اے انصار! خلفا ہم میں سے ہوں اور وزرا تم میں سے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا تھا کہ:

اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَیْش امام قریش میں سے ہوں۔

انصار میں سے حباب بن منذر نے کہا:

مخالفینِ اسلام کو ہم لوگوں نے اپنی تلواروں سے زیر کیا ہے۔ آج بھی اسلام کی قوت ہمارے دم سے قائم ہے۔ اس لیے ہمارا حق بھی تم سے کم نہیں۔ لہٰذا ایک امیر تم میں سے اور ایک ہم میں سے ہونا چاہیے

حضرت عمر رضؓ نے فرمایا:

اے گروہِ انصار! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، ہم کو تمہارے ساتھ حسنِ سلوک کی وصیت فرمائی ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تم کو خلافت کا حق دار سمجھتے، تو تم کو ہمارے ساتھ حسنِ سلوک کی وصیت فرماتے۔

اس پر بات بڑھی اور دونوں طرف سے تیز گفتگو ہونے لگی۔ اب حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کھڑے ہوئے اور لوگوں کو خاموش کر کے نہایت نرمی سے فرمایا:

انصار بھائیو! اللہ سے ڈرو، مکہ سے باہر اسلام کے اولین فداکار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے مددگار تم ہی ہو۔ اب تم ہی سب سے پہلے اس کو نقصان پہنچانے والے نہ بنو۔

حضرت ابو عبیدہؓ کے نرم الفاظ کا مجمع پر اثر ہوا، اور انصار کے قبیلۂ خزرج کے ہی ایک فرد، حضرت بشیر بن سعد بن نعمان نے اپنی قوم کو خطاب کر کے فرمایا:

بھائیو، بے شک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قریش کے خاندان سے تھے۔ اُن کا خاندان ہی ان کی جانشینی کا زیادہ مستحق ہے۔ اِس میں شک نہیں اسلام کو قوت پہنچانے میں ہماری مدد اور قربانیوں کو بڑا دخل ہے مگر اس سے ہمارا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے حصول اور اس کے نبی کی فرمانبرداری کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہمارے لیے ہرگز یہ مناسب نہیں کہ ہم اس کا معاوضہ طلب کریں اور لوگوں پر اپنا احسان اور حق جتائیں۔

انتخابِ ابو بکر صدیق رضؓ

اب جب انصار میں ہی سے ایک با اثر جماعت مہاجرین کی حامی ہو گئی تو مجمع کا رنگ بدل گیا اور یہ بات طے ہو گئی کہ خلیفہ مہاجرین میں سے ہو۔ مگر کون ہو، یہ ابھی طے نہیں ہوا تھا۔ اب حضرتِ ابو بکر صدیق رضؓ کھڑے ہوئے اور فرمایا:

بھائیو، عمر اور ابو عبیدہ تم میں موجود ہیں، ان میں سے کسی ایک کو انتخاب کر لو مگر ان دونوں صاحبان نے ایک زبان ہو کر کہا:

اے ابو بکر صدیقؓ! آپ کے ہوتے ہوئے ہم ایسی جرأت کیسے کر سکتے ہیں غارِ ثور کی تنہائی میں آپ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کی۔ انھوں نے اپنے زمانۂ علالت میں آپ کو اپنی جگہ مسجدِ نبوی کا امام بنایا۔ اِن فضائل کے بعد، حضورؐ کی جانشینی کے لیے آپ سے زیادہ موزوں و مستحق کون ہو سکتا ہے۔ آپ اپنا ہاتھ بڑھائیں تاکہ ہم آپ کی بیعت کریں۔

لیکن حضرت صدیقِ اکبرؓ نے ہاتھ نہ بڑھایا۔ اب حضرت عمر، حضرت ابو عبیدہ بن الجراح اور انصار میں سے حضرت بشیر بن سعد نے خود ہاتھ بڑھا کر حضرت صدیقِ اکبرؓ کی بیعت کر لی۔ اس کے بعد دوسرے تمام مسلمان بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔

اِس طرح بالاتفاق حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا خلیفہ منتخب کر لیا گیا۔

اس اہم مسئلہ سے فراغت کے بعد، مہاجرین و انصار، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں مصروف ہو گئے۔[1]

بیعتِ عام

دوسرے روز مسجدِ نبوی میں مدینہ منورہ کے تمام مسلمان اور باہر سے آنے والے جمع ہوئے اور خلافت کے لیے حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی عام بیعت ہوئی۔ بیعت کے بعد خلیفۂ رسول اللہ منبر پر تشریف لائے اور آپ نے ایک تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا۔ آپ نے فرمایا:

اے لوگو، میں تمہارا حاکم بنا دیا گیا ہوں، حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں اچھا کام کروں تو میری مدد کرو اور اگر غلطی کروں تو اصلاح کرو۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت۔ تم میں جو شخص کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے جب تک کہ میں اسے اس کا حق نہ دلا دوں۔ انشاء اللہ۔ اور تم میں جو شخص قوی ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے جب تک کہ میں اس سے دوسروں کا حق نہ لے لوں۔ ان شاء اللہ۔ جو قوم اللہ کے راستہ میں جہاد کو چھوڑ دیتی ہے اس کو خدا ذلیل کر دیتا ہے۔ اور جس قوم میں بدکاری پھیل جاتی ہے خدا اس میں مصیبت بھی پھیلا دیتا ہے۔ تم میری اُس وقت تک اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور رسول کی اطاعت کروں۔ لیکن جب میں اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کروں تو میں تمہاری اطاعت کا حقدار نہیں۔ نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے۔

---

[1] تاریخ ابنِ خلدون ص۶۲ و تاریخ ابن اثیر

یہ خطبہ "منشورِ خلافت" اور آئندہ کے لیے ان کے پروگرام کا اعلان تھا جس پر انھوں نے اپنے دورِ خلافت میں عمل کیا۔

حضرت علیؓ کی تاخیر

مگر، حضرت علی مرتضیٰ، گھر کے ذمہ دار ہونے کی وجہ سے پہلے تجہیز و تکفین میں مصروف رہے۔ پھر باہر سے آنے والوں کی مہمانداری میں۔ اس لیے آپ ان دونوں مجلسوں میں شریک نہ ہو سکے۔ پھر قرآنِ کریم کی جمع و ترتیب میں مصروف ہو گئے۔ تاہم آپ نے صدیقِ اکبرؓ کے انتخاب سے پوری طرح اتفاق کیا۔ قیس بن عباد روایت کرتے ہیں کہ ان سے حضرت علی مرتضیٰ نے فرمایا کہ:

> رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کئی دن اور کئی رات بیمار رہے۔ اُن دنوں جب اذان ہوتی تو آپ فرماتے: ابوبکر کو میرا حکم پہنچا دو کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی تو میں نے آپ کی جانشینی کے مسئلہ پر غور کیا، تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ نماز اسلام کا جھنڈا اور دین کی بنیاد ہے۔ لہٰذا ہم نے اپنی دنیوی رہنمائی کے لیے بھی اُسی شخص کو پسند کر لیا جس کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمارے دین کی پیشوائی کے لیے پسند فرمایا تھا۔ چنانچہ ہم نے حضرت ابوبکر رضؓ کی بیعت کر لی۔

مگر چونکہ یہ بیعت مجمعِ عام میں نہ تھی اس لیے بعض لوگوں میں غلط فہمی پیدا ہوئی۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے ان کے پاس ایک آدمی بھیجکر معلوم کیا کہ آپ میرے پاس تشریف کیوں نہیں لاتے۔ کیا آپ میری امارت کو ناپسند کرتے ہیں؟ حضرت علی رضؓ نے جواب دیا: "میں آپ کی امارت کو ناپسند نہیں کرتا لیکن نہ آنے کی وجہ یہ ہے کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک میں قرآنِ کریم کو جمع نہ کر لوں، نماز کے سوا کسی کام کے لیے باہر نہ نکلوں گا۔

چنانچہ چند ماہ بعد، جب حضرت علی مرتضیٰ رضؓ جمعِ قرآن کی مصروفیت سے فارغ ہو گئے تو مجمعِ عام میں تشریف لاکر حضرت صدیقِ اکبرؓ کی بیعت کر لی۔ (طبقات ابن سعد ج ۳ ق ۲ ص ۱۰۱)

حالاتِ قبلِ خلافت

آپ کا نام عبداللہ ہے۔ لقب صدیق اور عتیق۔ کُنیّت ابو بکر اور اسی سے مشہور ہوئے۔ والد کا نام عثمان ہے اور کنیت ابو قحافہ ہے۔ والدہ کا نام سلمیٰ ہے اور کنیت ام الخیر۔ آپ قریش کی شاخ بنی تیم سے ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب، چھٹی پُشت میں مُرّہ بن کعب پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے جا ملتا ہے۔ حضرت ابو بکرؓ واقعۂ فیل کے دو سال بعد پیدا ہوئے۔ والد ابو قحافہ ایک معزز اور خوشحال آدمی تھے۔ انھوں نے اپنے فرزند کو تجارت میں لگا دیا۔ حضرت ابو بکر نے اپنی محنت، دیانت داری اور خوش خُلقی کی وجہ سے اس میں بڑی کامیابی حاصل کی، اور مکہ کے بڑے تاجروں میں آپ کا شمار ہونے لگا۔ اسلام سے پہلے آپ کا شمار مکہ کے معزز سرداروں میں ہوتا تھا۔ خوں بہا کا مال آپ ہی کے پاس جمع ہوتا تھا اور سب آپ پر اعتماد کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بچپن ہی میں آپ کے گہرے تعلقات ہو گئے تھے۔ اکثر تجارت کے سفروں میں بھی آپ کے رفیق رہتے۔

سب سے پہلے قبولِ اسلام

رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر جب وحی اُتری اور آپ نے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی تو مَردوں میں سب سے پہلے حضرت ابو بکر صدیق نے ہی اسلام قبول کیا۔ پھر ہر طرح آپ کے مونس و غمگسار اور تبلیغِ اسلام میں آپ کے یار و مددگار رہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "بے شک سب سے زیادہ اپنی رفاقت اور اپنی دولت سے مجھ پر احسان کرنے والے ابو بکر ہیں۔"

مالی قربانیاں

ابتدائے اسلام میں، مکہ میں جن لوگوں نے پہلے پہل پیغامِ اسلام کو قبول کیا، اُن میں بڑی تعداد غلاموں اور لونڈیوں کی تھی۔ کیونکہ اسلام غریبوں اور کمزوروں کی حمایت کرتا تھا اور ظالموں کے ظلم سے مظلوموں کو بچاتا تھا۔ اسی لیے مکہ کے سردار اور امیر لوگ اپنے غلاموں کو، جن سے وہ جانوروں کی طرح کام لیتے تھے، قبولِ اسلام سے روکتے تھے۔ اور اگر وہ اسلام قبول کر لیتے تو ان پر لرزہ انگیز ظلم توڑتے تھے۔ حضرت ابوبکر نے ایسے بہت سے غلاموں اور باندیوں کو، ان کے ظالم آقاؤں سے خرید کر آزاد کیا۔ حضرت بلال حبشی، عامر بن فہیرہ، نہدیہ بنت نہدیہ وغیرہ ان میں شامل ہیں۔ اِس طرح، تقریباً چالیس ہزار درہم اپنے مال میں سے خرچ کیے۔ بعد میں ہر ملّی و دینی ضرورت کے وقت آپ نے بے تامل اپنی دولت صَرف کی۔ غزوۂ تبوک کے موقعہ پر، جو مسلمانوں کے لیے سختی اور تنگی کا وقت تھا اور دنیا کی سب سے بڑی طاقت، حکومتِ روم، اسلام اور مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دینے کا فیصلہ کر چکی تھی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے چندہ کی اپیل کی تو حضرت ابوبکر نے، اپنے گھر کا سامان و اسباب تک حضورؐ کے قدموں میں لاکر ڈال دیا۔ جب حضورؐ نے پوچھا: اے ابوبکر! گھر والوں کے لیے بھی کچھ چھوڑا ہے؟ تو آپ نے عرض کیا: اُن کے لیے اللہ اور رسول کافی ہیں۔

ابتلا و مصائب

اسلام کی اشاعت اور پیغمبرِ اسلام کی رفاقت میں آپ نے سخت سے سخت اذیتیں برداشت کیں اور اس راہ میں آپ نے اپنی جان کی پروا نہ کی۔ ایک دن کفارِ قریش صحنِ کعبہ میں بیٹھے ہوئے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے کہ اتفاقاً حضور خود وہاں تشریف لے آئے۔ سبھی آپ کو چاروں طرف

سے گھیر لیا اور آپ کے گلے میں ایک چادر کا پھندا ڈال کر کھینچنا شروع کیا۔ کسی نے حضرت ابو بکرؓ کو خبر کر دی، وہ تیزی کے ساتھ پہنچے اور فرمایا ظالمو! کیا تم ایسے شخص کو قتل کرتے ہو جو یہ کہتا ہے کہ "میرا مددگار خدائے واحد ہے"، اس پر ان ظالموں نے حضرت ابو بکرؓ کو اس قدر مارا کہ بے ہوش ہو گئے۔ اور دوسروں کے سہارے گھر لائے گئے۔ آپ کئی روز بے ہوشی ہی کی حالت میں رہے۔ جب تھوڑی دیر کے لیے ہوش آتا تو بار بار یہی کہتے کہ "محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کیسے ہیں؟ مجھے اُن کے پاس لے چلو"، آخر حضور کی خدمت میں لائے گئے۔ اور آپ نے ان کو تسلی و تشفی دی۔ جب آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بعافیت و سلامت دیکھا تو اطمینان ہوا۔

خطابِ صدّیقی

سنہ ۵ میں معراج کا واقعہ پیش آیا۔ دشمنوں نے اس کا بہت مذاق اڑایا۔ اور ان کو حضور کو جھٹلانے اور تکلیف پہنچانے کا ایک اور موقعہ ملا۔ انھوں نے حضرت ابو بکرؓ سے کہا: وہ تمہارے دوست محمد کہتے ہیں کہ انھوں نے اس رات مکہ سے بیت المقدس اور وہاں سے آسمانوں کا سفر کیا ہے پھر واپس بھی آ گئے ہیں۔ کیا تم اب بھی ان کی بات مانو گے؟ حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا کہ اگر یہ بات محمد کہتے ہیں تو مجھے اس کے ماننے میں کیا تامل ہو سکتا ہے؟ میں تو ان کی اس سے بھی زیادہ عجیب بات کو مان چکا ہوں۔ وہ یہ کہ فرشتے آسمانوں سے صبح و شام اُن کے پاس آتے ہیں اور اللہ کا پیغام لاتے ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ کے اس جواب پر ان کو بارگاہِ نبوّت سے صدّیق کا خطاب ملا، جس کے معنیٰ ہیں تصدیق کرنے والا۔

یارِ غار

پھر دو سال بعد، جب مکہ کی زمین حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں پر تنگ کر دی گئی، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو مدینہ منورہ ہجرت کرنے کا حکم ہوا۔

یہ معاملہ بڑا پُرخطر، نازک اور راز کا تھا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کے انتظام کی ساری ذمہ داری اپنے اسی ہمدم و ہم راز پر ڈال دی۔ آپ ہی نے سامانِ سفر اور زادِ راہ کا انتظام کیا، اور آپ ہی کو حضورؐ نے اپنا رفیقِ سفر بنایا۔ رات کے آخری حصہ میں، دشمنوں کی آنکھوں میں جو چاروں طرف لگے ہوئے تھے، خاک جھونکتے ہوئے آپ اپنے کاشانہ سے نکلے، حضرت ابوبکرؓ کے گھر پہنچے اور وہاں سے ان کو ساتھ لیکر، مکہ سے باہر جبلِ ثور پہنچے اور وہاں ایک غار میں روپوش ہو گئے۔ مکہ کے کافر آپ کو تلاش کرتے ہوئے غار کے کنارے پہنچ گئے۔ حضرت ابوبکر گھبرا اٹھے اور کہنے لگے: یارسول اللہ! دشمن اگر اپنے پاؤں کی طرف دیکھیں تو ہم کو پالیں گے۔ مجھے اپنی جان کی تو پروا نہیں، مگر ڈر ہے کہ کہیں حضور کا بال بیکا نہ ہو۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے اطمینان سے جواب دیا: اے ابوبکرؓ ان دو شخصوں کے متعلق تمہارا کیا گمان ہے جن کے ساتھ تیسرا اللہ ہو، غم نہ کرو، اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے،، یہ کلمات حضور کی زبان سے سنکر حضرت ابوبکرؓ کا دل سکون و اطمینان سے بھر گیا۔ قرآنِ کریم میں یہ گفتگو اس طرح نقل کی گئی ہے:

إِلَّا تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا ۚ فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ.

(التوبہ ۴۰)

اے مسلمانو، اگر بالفرض تم پیغمبر کی مدد نہ کرو تو اس سے اُس کا کیا بگڑتا ہے۔ درحقیقت اللہ نے اپنے پیغمبر کی اُس وقت مدد کی جب کافروں نے اسے مکہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا، اس حال میں کہ ایک اس کا رفیق تھا اور دوسرا وہ۔ جب دونوں غار میں چھپے ہوئے تھے۔ جب پیغمبر اپنے رفیق سے کہہ رہا تھا: غم نہ کرو بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے پس اللہ نے اس پر اپنی طرف سے سکون نازل فرمایا۔

یہ آیت حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت کی قرآنی دستاویز ہے۔

شرکتِ غزوات

ہجرت کے بعد، جب کفارِ عرب سے لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا تو حضرت ابوبکر تمام لڑائیوں میں شریک ہوئے اور کہیں آپ کا قدم پیچھے نہ ہٹا۔ اس یارِ وفادار نے بڑی بہادری اور اولوالعزمی کے ساتھ دشمنانِ اسلام کا مقابلہ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کا پورا پورا حق ادا کیا۔ غزوۂ اُحد اور غزوۂ تبوک میں دشمنوں کی حیلہ سازی کی وجہ سے اسلامی لشکر کے بعض سپاہیوں سے کچھ لغزشیں ہوئیں، مگر اسلام کے اس بہادر جنرل کا قدم پہاڑ کی طرح اپنی جگہ ہی رہا۔ آخری غزوہ تبوک کا تھا جو ۹ھ میں پیش آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ ہی کے ہاتھ میں لشکرِ اسلام کا جھنڈا دیا۔

امارتِ حج

اسی سال مسلمانوں پر حج فرض ہوا، کیونکہ اب مکہ معظمہ اسلام کے زیرِ اقتدار آچکا تھا، آپ خود تشریف نہ لے جاسکے بلکہ صدیقِ اکبر ہی کو اپنا قائم مقام اور امیرالحج بناکر روانہ کیا اور حکم دیا کہ اپنی نگرانی میں مسلمانوں کو حج کے مراسم اسلامی طریقہ پر انجام دلائیں۔ آپ کی روانگی کے بعد سورۂ توبہ کی وہ آیتیں اُتریں جن میں عرب کے غیر مسلموں سے تعلقات کے متعلق مسلمانوں کی پالیسی کا اعلان کیا گیا تھا۔ ان آیتوں کو سنانے کے لیے بعد میں حضرت علی مرتضیٰ رضؓ کو مکہ معظمہ روانہ کیا۔ حضرت علی رضؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق، حضرت صدیقِ اکبر رضؓ کی امارت میں حج ادا کیا۔ پھر ان آیتوں کو منیٰ میں پڑھ کر سنایا۔ یہ حج تاریخِ اسلام میں حجِ ابوبکر کے نام سے مشہور ہوا۔

امامتِ مسجدِ نبوی

ربیع الاول ۱۱ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری

نے شدت اختیار کی۔ چند روز آپ کسی نہ کسی طرح مسجدِ نبوی میں تشریف لے جاتے رہے۔ مگر جب کمزوری بڑھی اور امامت کی طاقت نہ رہی تو آپ نے حکم دیا کہ ابوبکر نماز پڑھائیں۔ حضرت عائشہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ ابوبکر رقیق القلب ہیں، وہ نماز نہ پڑھا سکیں گے۔ مگر آپ نے پھر سخت لہجہ میں یہی فرمایا کہ نہیں ابوبکر ہی نماز پڑھائیں۔ آخر سینہ پر پتھر رکھ کر حضرت ابوبکر نے حکمِ نبوی کی تعمیل کی۔ دنیا سے رخصت ہونے کے دن، نمازِ فجر کے وقت جب کچھ طبیعت سنبھلی، تو آپ نے حجرہ کا پردہ اٹھا کر مسجد کی طرف دیکھا۔ آپ نے مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کے ساتھ صدیقِ اکبر کے پیچھے نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا تو بے اختیار مسکرا دیے اور آپ نے بڑا اطمینان محسوس فرمایا۔ یہ مسجدِ نبوی کی امامت منصبِ خلافت کی تمہید تھی۔ اس سے صحابہ کرام کو منشائے نبوی کا علم ہو گیا، اور اسی کی بنیاد پر، حضرت علی مرتضیٰ رضؓ نے فرمایا: ہم نے اپنی دنیا کی رہنمائی کے لیے بھی اسی کو پسند کیا جس کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمارے دین کی پیشوائی کے لیے پسند فرمایا تھا۔"

حالاتِ بعدِ خلافت

لشکرِ اُسامہ کی روانگی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، اپنے زمانۂ علالت میں ہی، رومیوں سے غزوۂ موتہ کا انتقام لینے کے لیے، جس میں آپ کے چہیتے خادم حضرت زید بن حارثہ شہید ہوئے تھے، سرحدِ ملکِ شام کی طرف ایک لشکر بھیجنے کا ارادہ فرمایا تھا اور اُس کا سردار حضرت زید کے ہی نوجوان فرزند اُسامہ بن زید کو مقرر فرمایا تھا۔ مگر پہلے حضور کی بیماری کی شدت پھر وفات کی وجہ سے یہ لشکر نہ جا سکا اور مدینہ منورہ کے باہر ہی پڑا رہا۔

حضرت صدیقِ اکبرؓ نے عنانِ خلافت ہاتھ میں لیتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ اس لشکر کو روانگی کا حکم دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے یوں ہی مسلمانوں کی آنکھوں میں دنیا تاریک تھی۔ پھر مسلمانوں کے کھلے اور چھپے دشمنوں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کی۔ اور چاروں طرف سے فتنوں اور ہنگاموں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اس لیے صحابۂ کرام نے، جن میں حضرت عمر رضؓ جیسے جری بزرگ بھی شامل تھے، مشورہ دیا کہ کچھ عرصے کے لیے اس مہم کو ملتوی کر دیا جائے، اور پہلے اندرونی دشمنوں سے نمٹ لیا جائے۔ مگر حضرت ابوبکر رضؓ نے سختی کے ساتھ فرمایا کہ: خدا کی قسم اگر مدینہ اس طرح آدمیوں سے خالی ہو جائے کہ درندے آکر میری ٹانگ کھینچنے لگیں تب بھی میں اُس مہم کو نہیں روک سکتا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روانہ کرنے کا حکم دیا ہے،، بعض صحابہ نے عرض کیا کہ اگر لشکر بھیجنا ہی ہے تو پھر اُسامہ کے بجائے کسی معمّر اور تجربہ کار شخص کو اس کا سردار بنایا جائے

اُسامہ کی عمر صرف ۱۸ سال تھی۔ اس پر حضرت صدیق نے بگڑ کر کہا: جسے خدا کے رسول نے سردار بنایا ہو مجھے اُسے معزول کرنے کا کیا حق ہے؟[1]

غرض یہ لشکر، حضرت اسامہ بن زید کی سرداری میں روانہ کیا گیا۔ حضرت ابوبکر کچھ دور خود اسے رخصت کرنے تشریف لے گئے۔ حضرت اسامہ گھوڑے پر سوار تھے اور صدیقِ اکبر پیدل ان کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور ان کو نصیحتیں فرماتے جا رہے تھے۔ حضرت اسامہ نے بہت اصرار کے ساتھ عرض کیا کہ اے خلیفۂ رسول، یا تو آپ بھی سوار ہو جائیں یا مجھے بھی اجازت دیں کہ گھوڑے سے اتر آؤں۔ مگر صدیقِ اکبر رضؓ نے فرمایا "نہیں، کچھ ہرج نہیں، اگر میں بھی تھوڑی دور خدا کے راستہ میں اپنا پاؤں غبار آلود کرلوں"۔ لشکر میں دوسرے بڑے بڑے صحابۂ کرام کے ساتھ حضرت عمر رضؓ بھی شامل تھے۔ اور اس نازک موقعہ پر ان کا مدینہ میں موجود رہنا ضروری تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق نے بحیثیت امیرِ لشکر حضرت اسامہ سے درخواست کی کہ وہ ان کو مدینہ چھوڑ دیں۔ حضرت اسامہ نے اجازت دے دی۔

حضرت صدیق کے اس طرزِ عمل میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی عظمت و اہمیت، سردارِ لشکر کی اطاعت اور اسلامی مساوات و اخوت کی روشن مثالیں ملتی ہیں۔

گراں قدر نصیحتیں

حضرت اسامہ رضؓ کو اس موقعہ پر آپ نے جو گراں قدر نصیحتیں فرمائیں وہ بھی اسلام کے عادلانہ اصولِ جنگ کا زریں نمونہ ہیں۔ اور آج کی متمدن اور مہذب قوموں کے لیے جو جنگ میں دشمنوں کو تہس نہس کرنے میں ہر حربہ استعمال کرتی ہیں، ہسپتالوں اور اسکولوں کو مسمار کر دیتی ہیں، کنوؤں اور پانی کے ذخیروں

---

[1] الکامل ابنِ کثیر ج ۲ ص ۱۳۹

میں زہر ملا دیتی ہیں، اور اوپر سے خطرناک بم پھینک کر بستیوں کی بستیاں تباہ کر دیتی ہیں، عورتوں اور بچوں اور بیماروں کو بھی نہیں بخشتیں، عبرت و نصیحت کا بہترین سرمایہ ہیں۔

آپ نے فرمایا:

خبردار! خیانت نہ کرنا، کسی کو دھوکہ نہ دینا، کسی کا مال نہ چھپانا، کسی کے جسم کے اعضا کو نہ کاٹنا، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا، کھجور کے درختوں کو نہ جلانا، درختوں کو نہ کاٹنا، کسی جانور کو بے ضرورت نہ مارنا، تمہارا گزر ایسے لوگوں پر ہوگا جو اپنے عبادت خانوں میں گوشہ نشیں ہوں گے تو اُن سے تعرّض نہ کرنا اور جب تمہارے سامنے کھانا آئے تو اللہ کا نام لے کر کھانا۔[1]

لشکرِ اُسامہ نے حدودِ شام پر پہنچ کر، دشمن سے انتقام لیا اور چالیس روز کے بعد فتح و ظفر کے پرچم اڑاتا ہوا واپس آیا۔ حضرت صدیقِ اکبر اور صحابۂ کرام نے مدینہ منورہ سے باہر نکل کر جوش و خروش کے ساتھ استقبال کیا۔

---

[1] تاریخ ابن خلدون ج ۲ صـ ۶۵ مطبوعہ مصر۔

ظہورِ فتن و فسادات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوتے ہی، مکہ، مدینہ اور طائف کے شہروں کو چھوڑ کر عرب میں ہر طرف فتنہ و فساد کی آندھیاں چلنے لگیں اور خطرہ تھا کہ کہیں آفتابِ اسلام ان تاریکیوں کی اوٹ میں نہ آجائے۔ اِس کی مختلف وجوہات تھیں:

(۱) عرب کے لوگ ہمیشہ سے مختلف ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ہر قبیلہ کا سردار الگ ہوتا تھا۔ قتل و غارتگری ان کا پیشہ تھا۔ لوٹ مار اور چوا سٹلان کا ذریعۂ معاش، شراب ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اور زناکاری ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ اسلام نے آکر اِن سب کو ممنوع قرار دیا۔ عرب کے صحرانشینوں نے بادلِ ناخواستہ ان پابندیوں کو قبول کیا تھا اور وہ انھیں اپنی آزادی کے راستہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے۔

ہر قبیلہ کا سردار بھی مطلق العنان حکمراں ہوتا تھا۔ اسلام نے پورے عرب کو ایک لڑی میں پرو کر، اس قبائلی سرداری کے نظام کو ختم کر دیا اور سب کو ایک امیر کے ماتحت بنا دیا۔ قبائلی سرداروں نے اسے بھی اپنی حق تلفی سمجھا۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر سُن کر یہ لوگ اپنے سابقہ موقف پر لوٹنے کے لیے تیار ہو گئے۔

(۲) اسلام نے اپنے مالی نظام میں زکوٰۃ کو بنیادی حیثیت دی تھی۔ اس کا مقصد ایک ایسا معتدل معاشی نظام قائم کرنا تھا، جس میں نہ کوئی ضرورت سے زیادہ دولت کا مالک ہو اور نہ ایسا فقیر و محتاج کہ ضروریاتِ زندگی بھی پوری نہ کر سکے۔ کچھ لوگوں نے اسے بھی ایک جابرانہ ٹیکس قرار دیا اور اس کی ادائگی سے انکار کر دیا۔

(۳) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو پیغمبرِ اسلام کی حیثیت سے جو کامیابی ہوئی

اور جس طرح یمن سے شام تک لاکھوں مربع میل کے وہ بے تاج بادشاہ بن گئے، بعض نے اسے بھی آپ کی قوتِ بازو کا نتیجہ سمجھا اور اس خبط میں مبتلا ہو گئے کہ نبوت کا ڈھونگ رچا کر وہ بھی یہ مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے زیرِ اثر لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لیا اور ملک میں فتنہ مچا دیا۔

ان میں زیادہ تر نجد و یمن وغیرہ دور دراز علاقوں کے وہ لوگ تھے جنھوں نے فتحِ مکہ کے بعد اسلام کی ابھرتی ہوئی سیاسی طاقت کے آگے سر جھکا دیا تھا۔ انھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہ کر اپنے دلوں کے زنگ صاف کرنے اور انھیں اسلام کی روشن تعلیمات سے جگمگانے کا موقع نہ ملا تھا۔ قرآنِ کریم میں اُن کا ذکر اِن الفاظ میں فرمایا گیا ہے:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۔ 49:14

دیہاتی عرب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، اے رسول، آپ فرما دیجیے کہ تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یوں کہو کہ ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے اور ایمان تمہارے دلوں میں رچا بسا نہیں ہے۔

حضرت اُسامہ رضؓ کی واپسی کے بعد، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فوراً ان فتنوں کے انسداد کے لیے کمرِ ہمت باندھ لی۔ بعض صحابہ کی رائے تھی کہ جو لوگ صرف زکوٰۃ کی ادائگی سے انکار کر رہے ہیں، فی الحال ان کو چھوڑ دیا جائے، کیونکہ وہ اسلام کا انکار نہیں کر رہے ہیں۔ مگر حضرت ابوبکرؓ نے سخت لہجہ میں فرمایا:

"قسم خدا کی، اگر کوئی شخص ایک بکری کا بچہ دینے سے بھی انکار کرے گا، جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دیا کرتا تھا، تو میں اس کے خلاف بھی جہاد کروں گا۔"

پھر لشکرِ اسامہ کی واپسی کے بعد، حضرت اسامہؓ کو مدینہ منورہ میں اپنا قائم مقام بنایا، تاکہ وہ اور اُن کے ساتھی آرام کر لیں اور کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر عبس اور ذبیان کے باغیوں کی سرکوبی کے لیے خود نکل کھڑے ہوئے۔ یہ لوگ مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کا

پروگرام بنا رہے تھے۔ بعض صحابہ نے حضرت ابوبکر رضؓ سے کہا، اے امیرالمومنین! ہم آپ کو خدا کا واسطہ دیتے ہیں آپ تشریف نہ لے جائیں۔ خدانخواستہ آپ کا بال بیکا ہوا تو مسلمانوں کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ کسی اور کو بھیج دیجیے۔ مگر حضرت ابوبکر رضؓ نے نہ مانا اور خود ان قبائل پر حملہ آور ہوئے۔ ان میں سے اکثر لوگ میدانِ جنگ میں قتل ہوئے اور باقی نے راہِ فرار اختیار کی۔ حضرت صدیقِ اکبر رضؓ نے ان کی زمینوں کو جو مدینہ منورہ سے متصل تھیں، لشکرِ اسلام کے جانوروں کی چراگاہ بنا دیا۔

مُدّعیانِ نبوّت کی سرکوبی

جب لشکرِ اسامہ تازہ دم ہو گیا تو آپ اسے ساتھ لے کر مدینہ سے نکلے اور نجد کی سمت ایک برید (۱۲ میل) مقامِ ذوالقصہ پر پہنچے۔ پھر لشکرِ اسلام کو گیارہ حصّوں میں تقسیم کر کے، ہر دستہ کو ایک تجربہ کار افسر کے ماتحت کیا، اور مختلف دشمنوں کے مقابلہ میں ان کو روانہ کیا۔ ان گیارہ سرداروں کے نام یہ ہیں:

(۱) خالد بن ولید
(۲) عِکرِمہ بن ابی جہل
(۳) شُرَحبیل ابن حسنہ
(۴) مُہاجر بن ابی اُمیّہ
(۵) حُذَیفہ بن مُحصَن
(۶) عَرفَجہ بن ہَرثَمہ
(۷) سُوَید بن مُقرِّن
(۸) علاء بن الحضرمی
(۹) طُرَیفہ بن حاجز
(۱۰) عمرو بن العاص
(۱۱) خالد بن سعید

لشکروں کے روانہ کرتے وقت آپ نے مرتدین کے نام ایک ہی اعلان جاری کیا جس کا مضمون یہ تھا کہ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تم دینِ اسلام سے پھر گئے ہو اور تم نے شیطان کی اطاعت اختیار کر لی ہے حالانکہ وہ تمہارا دشمن ہے۔ میں تمہارے مقابلہ کے لیے مہاجرین و انصار کا ایک لشکر بھیج رہا ہوں۔ وہ تم سے لڑنے سے پہلے تم کو اسلام کی دعوت دیں گے۔ اگر تم نے اسے قبول کر لیا تو تم سے تعرض نہ کریں گے۔ اور اگر تم نے انکار کیا تو تم پر رحم نہ کیا جائے گا۔"

طُلَیحہ اسدی

طلیحہ بنی اسد کا ایک سردار تھا۔ حجۃ الوداع میں یہ شخص مکہ معظمہ آیا تھا، وہاں رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی شان دیکھ کر اس کے سر میں نبوّت کا خبط سمایا اور اس کی قوم اس کے ساتھ ہو گئی۔ بنی طے بنی اسد کے حلیف تھے۔ انھوں نے بھی اپنے دوستوں کا ساتھ دیا۔ قبیلۂ غطفان بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اس طرح خاصا انبوہ اس کے گرد جمع ہو گیا۔ اس کے مقابلہ کے لیے حضرت خالد بن ولید کو بھیجا گیا۔ چشمۂ بزاخہ پر انھوں نے طلیحہ کے لشکر پر حملہ کیا۔ حضرت عدی بن حاتم طائی کی کوشش سے بنی طے لڑائی سے پہلے ہی اس سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ پھر غطفان کا سردار عُیَینہ بن حِصن فزاری بھی جو اس کا مددگار تھا، اس سے علیحدہ ہو گیا۔ جب طلیحہ نے مقابلہ کی قوت نہ دیکھی اور شکست کے آثار ظاہر ہوئے، تو شام کی طرف بھاگ گیا اور دوبارہ اسلام قبول کر کے حضرت صدیقِ اکبر سے معافی مانگی۔ پھر حضرت عمر فاروق رضؓ کے زمانۂ خلافت میں عمرہ کے لیے مکہ معظمہ آیا اور خدمتِ اسلام کی خواہش ظاہر کی۔ حضرت عمر رضؓ نے اسے لشکرِ شام کی مدد کے لیے شام بھیج دیا، جہاں اس نے اچھی خدمات انجام دیں۔

مُسیلمۂ کذّاب

اِس شخص نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے آخر زمانہ ہی میں نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا

یہ شخص اپنے قبیلہ بنی حنیفہ کے وفد میں شریک ہو کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں اس شرط پر اسلام قبول کروں گا کہ آپ اپنے بعد مجھے اپنا جانشین بنا دیں۔ حضورؐ کے دستِ مبارک میں اس وقت کھجور کی ایک ٹہنی تھی۔ آپ نے فرمایا: اگر تو قبولِ اسلام کے عوض یہ ٹہنی بھی مجھ سے مانگے گا تو نہ دوں گا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تو وہی کاذب ہے جس کی خواب میں مجھے پہلے ہی خبر دی جا چکی ہے۔"

مُسیلمہ اپنے وطن واپس پہنچا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری کی خبر سنی تو نبوّت کا دعویدار بن بیٹھا۔ اس نے حضورؐ کو خط لکھا کہ "میں نبوت میں آپ کا شریک بنا دیا گیا ہوں۔ لہٰذا نصف دُنیا آپ کی ہے اور نصف میری"۔ حضورؐ نے اس کا جواب دیا:

"محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے مُسیلمۂ کذاب کے نام۔ اما بعد،
زمین کا مالک اللہ تعالیٰ ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے گا اس کا وارث بنا دے گا۔ اور نیک انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے۔"

حضورؐ کی وفات کے بعد وہ کھل کر میدان میں آ گیا۔

نبوت کے جھوٹے دعوے کا مرض اتنا پھیل گیا تھا کہ ایک عورت سُجّاح نے بھی نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا اور بہت سے آوارہ گرد اس کے ساتھ لگ لیے تھے۔ مُسیلمہ نے اپنی طاقت مضبوط کرنے کے لیے اس کے ساتھ شادی کر لی۔ اور دونوں نے مِل کر اپنے علاقوں میں بڑا فتنہ کھڑا کر دیا۔

حضرت صدیقِ اکبرؓ نے واقعہ کی اہمیت دیکھتے ہوئے حضرت خالد بن ولید کو جو بنی اسد سے نمٹ چکے تھے، مسیلمہ کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ شُرحبیل بن حسنہ کو ان کی مدد کرنے کا حکم دیا گیا۔ مسیلمہ چالیس ہزار جوانوں کو ساتھ لے کر مقابلہ کے لیے نکلا اور نہایت ہولناک جنگ ہوئی۔ مسلمانوں کی بڑی تعداد نے جامِ شہادت نوش کیا۔ ان میں تقریباً ستّر قرآنِ کریم کے حافظ تھے۔

مگر خالد بن ولید نے آگے بڑھ کر زبردست یلغار کی۔ اور مسیلمہ کو مُبارزت کے لیے للکارا وہ مقابلہ کی تاب نہ لا کر بھاگا اور اس کی فوج کے قدم اکھڑ گئے۔

مسیلمہ ایک باغ میں جس کے چاروں طرف مضبوط چہار دیواری تھی، اور جس کا نام اس نے "حدیقۃ الرحمان" رکھا تھا، چھپ گیا۔ اور باغ کے دروازے بند کر لیے۔ ایک انصاری حضرت براء بن مالک نے کہا مجھے باغ کے اندر پھینک دو، چنانچہ پھینک دیا گیا۔ انھوں نے تنِ تنہا پہریداروں کو قتل کر کے باغ کے دروازے کھول دیے اور نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ اب اسلامی فوج اندر گھس گئی۔ حضرت وحشی نے (جن کے ہاتھوں اُحد میں حضرت حمزہؓ شہید ہوئے تھے) مسیلمہ پر تلوار کا وار کر کے اسے موت کے گھاٹ اتارا اور یوں حضرت حمزہ کے قتل کا کفارہ ادا کر دیا۔ مسیلمہ کے قتل کے بعد اس کی قوم نے دوبارہ اسلام قبول کر لیا۔

اسود عنسی

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانۂ حیات میں، یمن میں قبیلہ عنس کے ایک شخص اسود عنسی نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ قبیلہ عنس اور مذحج کے بہت سے لوگ اس کے پیرو ہو گئے۔ پہلے اسود نے نجران پر حملہ کر کے وہاں کے عامل عمرو بن حزم کو نکال دیا۔ پھر صنعاء پر حملہ آور ہوا۔ اور وہاں کے عامل شہر بن باذان کو (جن کا خاندان کسریٰ کے زمانہ سے یمن کا حاکم چلا آ رہا تھا) قتل کر کے صنعاء پر قبضہ کر لیا۔ ان فتوحات سے سارے یمن میں اس کی شہرت پھیل گئی اور بہت سے شرپسند اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ اس فتنہ کا قلع قمع کرنے کے لیے قیس ابن مکشوح اور فیروز دیلمی کو بھیجا۔

اسود نے شہر بن باذان کو قتل کر کے اس کی بیوی سے شادی کر لی تھی، مگر وہ اس کو پسند نہ کرتی تھی۔ شہر بن باذان کے آدمیوں نے اس کی بیوی کی مدد سے، رات کے وقت اسود کو جب کہ وہ نشہ میں مدہوش تھا قتل کر دیا۔ اس کے بعد یمن میں امن قائم ہو گیا۔ مرتدین نے دوبارہ اسلام قبول کیا۔ جس روز صبح کو یہ خبر مدینہ پہنچی، اسی روز حضرت ابوبکرؓ کی بیعت ہوئی تھی۔

جب اہلِ یمن کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر پہنچی تو ان کے سردار قیس بن عبد یغوث اور عمرو بن مَعدِی کَرِب نے دوبارہ شورش شروع کردی۔ حضرت ابوبکر رضؓ نے مہاجر بن ابی امیہ کی سربراہی میں مجاہدین کا لشکر روانہ کیا۔ اِس لشکر نے دونوں باغی سرداروں کو گرفتار کرلیا اور صنعاء پر اسلامی فوج کا قبضہ ہوگیا۔ باغی سردار گرفتار کرکے مدینہ لائے گئے۔ انھوں نے اپنے کرتوتوں کی معافی چاہی اور تجدید اسلام کی۔

قبیلۂ کِندَہ نے حضرموت میں بھی بغاوت کی آگ بھڑکا دی تھی، یمن سے فارغ ہوکر مہاجر اُدھر روانہ ہوئے۔ حضرت عکرمہ بن ابی جہل بھی اپنا لشکر لے کر ان کی مدد کو پہنچ گئے۔ دونوں نے مل کر مرتدین کو شکست دی۔ ان کے سردار اشعث کو گرفتار کیا اور مدینہ منورہ فتح کی خوش خبری بھیجی۔

مدعیانِ نبوت کے علاوہ کچھ سردارانِ قبائل نے زکوٰۃ کو ٹیکس سمجھ کر اس کی ادائگی سے انکار کردیا۔ ان میں بنی تمیم کا ایک شخص مالک بن نُویرہ بھی تھا۔ پہلے گزر چکا ہے کہ ان لوگوں سے جہاد کرنے میں صحابۂ کرام میں اختلافِ رائے ہوا۔ بعض نے کہا کہ یہ منکرینِ اسلام نہیں ہیں۔ فی الحال ان سے نہ الجھا جائے۔ مگر حضرت صدّیقِ اکبر نے نہایت سختی کے ساتھ فرمادیا کہ اگر کوئی شخص ایک بکری کا بچہ بھی (جسے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دیا کرتا تھا) نہ دے گا تو میں اس کے ساتھ جہاد کروں گا۔ چنانچہ حضرت خالد بن ولید، طلیحہ کی مہم سے فارغ ہوکر اس کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوئے۔

ضابطہ کے مطابق، حضرت خالد نے مجاہدینِ اسلام کو بھیجا کہ وہ پہلے انھیں دعوتِ اسلام دیں اور اگر وہ قبول نہ کریں تو ان کو گرفتار کرلائیں۔ چنانچہ بنی تمیم کے اکثر لوگوں نے اسلام قبول کرلیا اور زکوٰۃ کی ادائگی کا وعدہ کیا۔ باقی لوگوں کو مسلمان گرفتار کرلائے۔

گرفتار ہوکر آنے والوں میں بنی تمیم کا سردار مالک بن نُویرہ بھی تھا۔ کچھ لوگوں

نے بیان کیا کہ اس نے، اسلامی فوج کے پہنچنے پر اذان دلوادی تھی۔ مگر حضرت خالد سے گفتگو کے وقت اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار نہ کیا۔ آخر مالک اور اس کے ساتھیوں کو قتل کرا دیا گیا۔ اور اس کی بیوی سے حضرت خالد بن ولید نے نکاح کر لیا۔

بعض لوگوں نے حضرت صدیقِ اکبرؓ سے شکایت کی کہ حضرت خالد کو مالک کو قتل نہ کرانا چاہیے تھا اور مطالبہ کیا کہ ان سے قصاص لیا جائے۔ مگر حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ "اگر خالد سے غلطی ہوئی ہے تو وہ واقعہ کی تاویل میں ہوئی ہے۔ اور میں اللہ کی اُس تلوار کو نہیں چُھپا سکتا جسے اللہ نے کافروں پر کھینچی ہے"، پھر ان کے مخالفین کی دل داری کے لیے اپنے پاس سے مالک بن نُویرہ کی دِیَت ادا کر دی۔[1]

---

[1] تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۴۳ مطبوعہ مصر۔

مُرتدّین اور باغیوں کی سرکوبی

جھوٹے مدعیانِ نبوت اور مانعینِ زکوٰۃ سے فارغ ہو کر، حضرت صدیقِ اکبرؓ نے دوسرے مُفسدین کی طرف توجہ کی۔

ربیعہ کے قبائل عبدالقیس اور بنو بکر وغیرہ بحرین میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مرتد ہو گئے تھے۔ عبدالقیس تو اپنے سردار حضرت جارُودؓ بن مُعلّیٰ کی فہمائش پر اس فتنہ سے باز آ گئے۔ جارود نے اپنی قوم سے پوچھا کہ تم کیوں اسلام چھوڑ بیٹھے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو مر گئے۔ اگر وہ نبی ہوتے تو کیوں مرتے؟ جارود نے کہا: کیا حضرت محمدؐ سے پہلے بہت سے اور نبی نہیں ہو چکے ہیں؟ وہ بھی تو مرے! پھر حضرت محمدؐ ہی وفات پا گئے تو کیا ہوا، وہ تو بس پیغمبر ہی تھے، اللہ جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہنے والا ہے وہ تو زندہ ہے! یہ سُن کر عبدالقیس دوبارہ داخلِ اسلام ہو گئے۔

مگر بنو بکر کفر پر اڑے رہے۔ ان کا سردار حطم بن ربیعہ ان کو لے کر عبدالقیس کے مقابلہ کے لیے نکلا۔ حضرت صدیقِ اکبرؓ نے حضرت علاء بن حضرمی کو حطم کے مقابلہ کے لیے روانہ کیا۔ حطم اپنی جماعت کو لے کر میدان میں آیا۔ دونوں لشکروں نے اپنی اپنی حفاظت کے لیے خندقیں کھود رکھی تھیں۔ دونوں طرف کے لشکر صبح کو مقابلہ کے لیے نکلتے اور شام کو واپس آ جاتے۔

ایک رات مسلمانوں نے حطم کی فوج میں شور و شغب کی آوازیں سنیں۔ معلوم ہوا کہ سب نشہ میں چور ہو کر غُل مچا رہے ہیں۔ حضرت علاء نے موقعہ کو غنیمت سمجھا۔ اور لشکرِ اسلام نے خندق کو عبور کر کے دشمن پر حملہ کر دیا۔ بے شمار کافر قتل ہوئے اور باقی گرفتار کر لیے گئے۔ سردارِ لشکر حطم بھی قتل ہوا۔ کچھ قریب کے جزیرہ دارین میں جا گھُسے۔

اسی طرح مغرور بن سُوَید بن مُنذر نے، جو نعمان بن منذر شاہِ حیرہ کا بھتیجا تھا، جواثیٰ میں سر اُٹھایا۔ بہت سے شورش پسند اس کے ساتھ ہو گئے اور انھوں نے اسے اپنا بادشاہ بنا لیا۔ حطم کے آدمیوں نے بھی اس کی مدد کی۔ حضرت علاء بن حضرمی نے جواثیٰ پہنچ کر مغرور بن سوید کو بھی شکست دیکر قتل کیا اور اس کا فتنہ بھی ختم کیا۔

اسی طرح عمان میں لَقِیط ابن مالک اَزدی نے شورش برپا کی اور نبوت کا دعویٰ کر دیا اور عمان پر قابض ہو گیا۔ حضرت حُذیفہ بن مُحصَن ایک لشکر لے کر اس کے مقابلہ کے لیے پہنچے اور اسے تہ تیغ کر کے اس کا فتنہ دبایا۔

اسی طرح یمن، کِندَہ، حضرموت، مَہرہ وغیرہ کے علاقوں میں مرتدوں اور باغیوں کی سرکوبی کے لیے متعدد لشکر بھیجے گئے۔ اور مفسدین کو زیر کر کے، دوبارہ علمِ اسلام آن بان کے ساتھ لہرایا گیا۔[1]

امدادِ غیبی

اللہ کے راستہ میں اپنی جانوں کی قربانی پیش کرنے والوں اور اللہ کے دین کا جھنڈا بلند کرنے والوں کو، اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق جا بجا غیبی مدد بھی حاصل ہوتی رہی۔

حضرت علاء بن حضرمی، بحرین کے معرکہ میں ایک چٹیل میدان میں سے گزر رہے تھے۔ جب بیابان کے درمیان پہنچے تو انھوں نے اپنی فوج کو آرام کا حکم دیا چنانچہ اپنے اپنے جانور کھول کر سب سو گئے۔ جاگے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سب جانور بھاگ گئے ہیں۔ پھر یہاں پانی کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ مجاہدین بہت گھبرائے اور سمجھنے لگے کہ اب اِس میدان میں پیاسے ہی مر جائیں گے۔ حضرت علاء حضرمی نے ان کو تسلی

---

[1] تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۷۵

دی اور کہا بھائیو، تم اللہ کے راستہ میں اس کے دشمنوں سے لڑنے کے لیے نکلے ہو۔ تم کو اللہ تعالیٰ ضائع نہ ہونے دے گا۔ پھر دو رکعت نماز ادا کر کے بارگاہِ خداوندی میں دُعا کے لیے اپنے ہاتھ اٹھا دیے۔ اور عرض کیا کہ اے اللہ مسلمانوں کو اِس مُصیبت سے نجات دے۔

یکایک ایک گھوڑے نے پاؤں مارا، تو پانی کا صاف و شفاف چشمہ نمودار ہوا سب نے پیٹ بھر کر پیا اور نہائے۔ پھر تھوڑی دیر بعد جانور بھی اِدھر اُدھر سے آکر جمع ہو گئے۔ سب نے اللہ کا شکر ادا کیا اور آگے روانہ ہوئے۔[1]

پھر جب بحرین کے مفرورین کا پیچھا کرنے دارین کی طرف بڑھے تو راستہ میں سمندر کا ٹکڑا پڑتا تھا۔ یہ ایک دن اور ایک رات کی مسافت تھی۔ گھوڑوں اور اونٹوں کے سوا کوئی سواری نہ تھی۔ حضرت علاء نے کہا: بھائیو! تم خشکی میں اللہ کی مدد کا تماشا دیکھ چکے ہو۔ اب دریا میں بھی دیکھ لو۔ چنانچہ ان کے حکم سے مجاہدین نے اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کو سمندر میں ڈال دیا۔ سب کی زبانوں پر یہ دعا تھی: "یا ارحم الراحمین ہماری حفاظت فرما"، بحکم خدا سمندر پایاب ہو گیا اور لشکرِ اسلام اس طرح گذر گیا جیسے میدان میں گزر رہا ہو۔ مجاہدین نے دارین میں گھس کر، مفرور دشمنوں کو قتل کیا اور بے شمار مالِ غنیمت لے کر لوٹے۔[2]

ان واقعات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آفتابِ اسلام کو کیسے کیسے تاریک بادلوں نے گھیر لیا تھا اور دین کے چراغ کو بجھانے کے لیے آندھیوں کے کیسے کیسے جھکڑ چلنے لگے تھے۔ یہ حضرت صدیق اکبر ہی کی قوتِ ایمانی تھی کہ آپ ذرا نہ گھبرائے اور پوری جرأت و ہمت کے ساتھ دشمنوں کی کثرت و طاقت کی پروا کیے بغیر دیوارِ آہنی بن کر ان فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۶ ص ۳۳۸

[2] تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۷۷

کھڑے ہو گئے۔ اور اولوالعزمی اور دور بینی کے ساتھ دشمنانِ اسلام کا قلع قمع کر کے جزیرۃ العرب کو پھر اسلام کا مضبوط قلعہ بنا دیا اور اس کے چپہ چپہ پر اسلام کا جھنڈا لہرا دیا۔ دراصل حضرت صدیقِ اکبرؓ کا یہ کارنامہ جس کی تاریخِ اسلام میں مثال نہیں ملتی، پیغمبرانہ جرأت و ہمت کا نمونہ ہے۔ اور پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اولیں جانشین ہونے کی حیثیت سے وہی اس کے انجام دینے کے سزاوار تھے۔ مسلمان خلیفۂ اول کے اِس احسانِ عظیم سے کبھی سُبکدوش نہیں ہو سکتے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

مسلمانوں کی حریف طاقتیں
فارس و روم

عرب کے پہلو میں فارس اور روم کی دو عظیم الشان حکومتیں تھیں جن کی طاقت و شوکت کا ڈنکا ساری دنیا میں بج رہا تھا۔ اور جن کے علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے اثرات ساری دنیا میں چھائے ہوئے تھے۔ یہ دونوں شہنشاہیتیں ملکِ عرب پر للچائی ہوئی نظر رکھتی تھیں۔ اور اگرچہ عربوں نے اپنی فطری بہادری اور آزاد پسندی کی وجہ سے انھیں ملک کے اندرونی علاقوں پر قابض ہونے نہیں دیا تھا مگر عرب کے سرحدی علاقوں پر انھوں نے اپنا اثر قائم کر رکھا تھا۔

فارس کی حکومت نے عراق اور یمن کے صوبوں میں اور رومی حکومت نے شام و فلسطین میں اپنی ماتحت ریاستیں قائم کر رکھی تھیں۔ ان ریاستوں کے رئیس جو عرب ہی تھے اُن کے باج گزار تھے۔ یہ اندرونی طور پر خود مختار تھے اور بادشاہ کہلاتے تھے۔

۶ھ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے بادشاہوں کو دعوتِ اسلام کے خط لکھے۔ شہنشاہِ فارس کسریٰ پرویز کو بھی آپ نے خط لکھا۔ اس ظالم نے مغرورانہ انداز میں آپ کے خط کو پُرزے پُرزے کر دیا اور اپنے یمن کے گورنر باذان کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ جب باذان کے سپاہی حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا جاؤ، تمہارا شہنشاہ مارا جا چکا ہے، اس کی حکومت بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوگی اور اس کی جگہ اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ چنانچہ یہی ہوا کہ کسریٰ پرویز کو اس کے بیٹے شیرویہ نے قتل کر دیا اور چند سال ہی میں فارسی شہنشاہیت پارہ پارہ ہوگئی۔

اِسی طرح آپ نے شہنشاہِ روم کو دعوتِ اسلام کا خط بھیجا۔ قیصر کو یہ خط اس وقت ملا جب وہ آرمینیا سے ایک بغاوت فرو کرنے کے بعد لوٹا اور ایرانیوں پر اپنی عظیم الشان فتح کا شکر ادا کرنے کے لیے بیت المقدس آیا۔ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خط احترام کے ساتھ لیا۔ وہ اسلام کی طرف مائل تھا مگر رومی سرداروں اور پادریوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اور سفیرِ اسلام ناکام لوٹ آئے۔

شرحبیلؓ بن عمر غسانی بلقاء کا حاکم تھا اور شہنشاہِ روم کا باج گزار۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سردارِ شام کے نام بھی ایک تبلیغی خط بھیجا تھا۔ اس ظالم نے حضورؐ کے قاصد حضرت حارث بن عمیرؓ کو راستہ میں شہید کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ کی افسری میں تین ہزار مجاہدینِ اسلام کو اس کے مقابلہ کے لیے روانہ کیا۔ شرحبیل ایک لاکھ فوج لے کر مقابلہ کے لیے نکلا۔ قیصرِ روم نے بھی اس کی مدد کے لیے اپنی فوج بھیجی۔ حضرت زید بن حارثہ اس معرکہ میں شہید ہوئے اور آخر حضرت خالد بن ولید مسلمانوں کی شجاعت کی دھاک بٹھا کر لشکرِ اسلام کو فاتحانہ طور پر نکال لائے۔

شہنشاہِ روم کو اس نئی اُبھرتی ہوئی اسلامی طاقت کا اندازہ ہوا تو اس نے زبردست فوجی تیاریاں شروع کر دیں۔ اپنی اور اپنے ماتحت سرحدی عرب سرداروں کی امدادی فوجیں لے کر ۹ھ میں اس نے مدینہ منورہ کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا مگر مدینہ یہ خبریں پہنچیں تو رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس تیس ہزار صحابۂ کرام کا لشکرِ جرار لے کر سرحدِ شام کے مقام تبوک پر لشکر انداز ہوئے۔ شہنشاہِ روم اسلام کے جیالوں کی اس جرأتمندانہ پیش قدمی کو دیکھ کر مرعوب ہو گیا اور اپنا عظیم الشان لشکر لے کر واپس لوٹ گیا۔ کئی سرحدی رئیسوں نے قیصر کی اِس کمزوری کو دیکھ کر اسلامی حکومت کی ماتحتی قبول کر لی۔ یوں تو قیصر اس وقت واپس چلا گیا۔ مگر اسلامی طاقت کے خوف سے اس کی نیند حرام ہو گئی۔ اور وہ زور شور سے مقابلہ کی تیاریاں کرنے لگا۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس سے غافل نہ تھے۔ چنانچہ آپ نے ۱۱ھ میں حضرت اُسامہ بن زید کی سپہ سالاری میں ایک فوج ملکِ شام پر حملہ کے لیے روانہ فرمانے کا ارادہ فرمایا۔ مگر ابھی یہ لشکر روانہ نہ ہوا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی۔ پھر حضرت ابوبکر صدّیق نے، خلافت کی ذمہ داری قبول کرتے ہی پہلا حکم یہی دیا کہ لشکرِ اسامہ شام کی طرف روانہ ہو۔ یہ فوج ظفر موج دشمنانِ اسلام کو خوف زدہ کر کے فاتحانہ واپس آئی۔ اور کسی کو اس کے مقابلہ کی ہمت نہ ہو سکی۔

اِس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں دُنیا کی عظیم الشان حکومتیں، عرب کی اس نئی اُبھرتی ہوئی طاقت کو خوف و حذر کی نگاہ سے دیکھتی تھیں اور مسلمان بھی چکّی کے ان دونوں پاٹوں کے بیچ میں اپنے آپ کو محفوظ نہ سمجھتے تھے۔ اس لیے اندرونِ عرب کے فتنوں کی آگ بُجھاتے ہی، حضرت صدیق اکبرؓ ان دونوں طاقتور دشمنوں کی طرف متوجہ ہوئے، اور اسلامی فوجوں کا رخ عراق و شام کی سرحدوں کی طرف پھیر دیا۔ چونکہ ان دونوں حکومتوں سے، عہدِ خلافتِ راشدہ میں مسلمانوں کے مسلسل معرکے رہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر ان کے کچھ حالات بیان کر دیے جائیں۔

سلطنتِ فارس

سلطنت فارس یا ایرانی حکومت کی حدود میں، آج کل کے ایران، عراق، افغانستان، روسی ترکستان اور سندھ کے علاقے شامل تھے۔ یمن اور عراق میں اس کی ماتحت ریاستیں قائم تھیں جو شہنشاہِ فارس کو خراج ادا کرتی تھیں۔ ان کے حکمراں بادشاہ کہلاتے تھے۔ اور شہنشاہِ ایران کو خسرو یا کسریٰ کہا جاتا تھا۔ اس کا دارالسلطنت مدائن کا عظیم الشان شہر تھا جو دریائے دِجلہ کے مشرقی اور مغربی کناروں پر پھیلا ہوا تھا۔ یہیں وہ عظیم و جمیل قصرِ ابیض تھا جس کے کھنڈر آج بھی اس کی عظمت کی داستان سنا رہے ہیں۔

آغازِ اسلام میں فارس پر ساسانی خاندان کی حکومت تھی۔ سکندرِ اعظم کے حملہ کے بعد ۲۳۰ء میں اس خاندان کی حکومت کی بنیاد اردشیر بن بابک نے ڈالی۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش اسی خاندان کے مشہور نیک نام بادشاہ نوشیرواں کے زمانہ میں ہوئی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر کہ "میں عادل بادشاہ نوشیرواں کے زمانہ میں پیدا ہوا ہوں" اُس کی نیک نامی پر مہرِ تصدیق لگا دی۔ اس کے بعد ہُرمز، پھر کسریٰ پرویز تخت نشین ہوا۔ پرویز وہی بادشاہ ہے جس کے نام رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلام کا خط بھیجا تھا۔ اور اس ظالم نے اسے پُرزے پُرزے کر دیا تھا اور اپنے یمن کے گورنر باذان کو حضورؐ کی گرفتاری کا حکم دیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ اس کا عظیم الشان ملک بھی جلد ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ جلد ہی اپنے بیٹے شیرویہ کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا۔ شیرویہ بھی ایک سال نو مہینے حکومت کرنے کے بعد مر گیا۔ اس کے بعد اس کا کم سن بیٹا اردشیر بادشاہ بنایا گیا۔ اور ایک امیر اس کا نگراں مقرر کیا گیا۔ مگر ایک دوسرا امیر شہربراز کو، جو رومی سرحدوں کا سپہ سالار تھا اس سے ناگواری ہوئی اور اس نے مدائن پر حملہ کر کے تختِ حکومت پر خود قبضہ کر لیا۔ مگر چونکہ وہ خود شاہی خاندان سے نہ تھا اس لیے دوسرے اُمراء کو اس کی بادشاہی پسند نہ آئی۔ اور ابھی چالیس دن بھی حکومت نہ کرنے پایا تھا کہ اسے بھی قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد پوران دخت کو، جو کسریٰ پرویز کی بیٹی تھی، تخت نشین کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانہ میں وہی حکمراں تھی۔ اسی کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "وہ قوم فلاح نہیں پا سکتی جس کی حکمراں ایک عورت ہو۔" ایک سال چار ماہ حکومت کرنے کے بعد وہ بھی مر گئی۔ اس کے بعد اس کا چچیرا بھائی جواں شیر بادشاہ بنایا گیا جو ایک ماہ بھی حکومت نہ کر سکا۔ اس کے بعد خسرو پرویز کی دوسری بیٹی آرزمی دخت تخت نشین کی گئی۔ اسے ایک فوجی سردار رستم نے اپنے باپ کے انتقام میں قتل کر دیا۔ پھر اس کی جگہ اردشیر بن بابک کے خاندان

آرزمی

میں سے ایک شہزادہ کسریٰ بن مہر بادشاہ بنایا گیا۔ وہ صرف چند روز حکومت کر سکا۔ آخر یزدجرد بن شہریار کو تخت نشین کیا گیا جس نے حضرت عثمان کے زمانہ میں، لشکرِ اسلام سے شکست کھا کر راہِ فرار اختیار کی۔ آخر دریائے مرغاب کے کنارے ایک پن چکی والے کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اور ایرانی شہنشاہی کا خاتمہ ہوا۔

اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی پوری ہوئی اور ۶ھ سے ۲۵ھ تک، صرف ۲۵ سال میں ایرانی شہنشاہیت کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔

مورخوں نے اس عظیم الشان سلطنت کے زوال کی بہت سی وجوہات لکھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شیرویہ کے زمانہ میں قیصرِ روم کے ہاتھوں ایرانیوں کی شکست کے بعد ایرانی قوم پر مایوسی چھا گئی اور ان میں سخت اختلافات پیدا ہو گئے۔ بادشاہت اُمرار کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن گئی تھی۔ ہر امیر اپنے پسند کے آدمی کو حکمراں بنانا چاہتا تھا۔ حرمِ شاہی کی عورتیں ملکی سیاست میں دخیل ہو گئیں۔ اپنے مخالفوں کو قتل کرانے اور اپنے حامیوں کو نوازنے کے لیے شاہی محل میں جوڑ توڑ میں مصروف رہتیں۔ جس کی مخالفت ہو جاتی اسے طرح طرح کی سزائیں دلواتیں۔ زمین میں آدھا جسم گڑوا کر پتھروں سے مروانا، گرم راکھ میں دفن کر دینا، حلق سے زبان کھچوا لینا معمولی بات تھی۔

امیروں اور غریبوں کے درمیان معاشرت میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ غریب ٹیکسوں کی بھرمار سے روٹیوں تک کو محتاج رہتے اور امیر اپنی کمر میں ایک لاکھ روپے کا پٹکا باندھتے تھے۔ بدکاری سوسائٹی کا جزو بن گئی تھی۔ بھائی بہن اور باپ بیٹی تک میں تمیز نہ کی جاتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے کچھ پہلے مزدک کا ظہور ہوا۔ اس نے زر، زمین اور زن کو عام ملکیت قرار دے دیا۔ عیش پرستی و ہوس رانی کی خوب گرم بازاری ہوئی۔

مذہبی اختلافات بھی بہت بڑھ گئے۔ آخری زمانہ میں زرتشتی علماء دربار پر چھا گئے۔ انھوں نے دوسرے فرقوں، یہودی عیسائی، صابی اور بدھ مذہب کے

ماننے والوں پر، جو ہندوستان سے تعلقات کی وجہ سے خاصی تعداد میں تھے، سخت ظلم توڑنے شروع کر دیے۔ اس طرح سارا ملک اختلافات اور فسادات کی آگ میں جلنے لگا۔[1]

سلطنتِ روم

رومی حکومت، اُس زمانہ میں دنیا کی دوسری عظیم الشان حکومت تھی جو اپنی وسعت، فوجی طاقت اور علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کی ترقی کی وجہ سے دنیا میں شہرت رکھتی تھی۔ پہلے اس کا دارالسلطنت شہر روما تھا جو آج کل اٹلی کا صدر مقام ہے۔ ۳۹۵ء میں عظیم رومی حکومت دو حصّوں میں تقسیم ہو گئی: مغربی روم اور مشرقی روم۔ مغربی روم کا صدر مقام روما اور مشرقی روم کا صدر مقام قسطنطنیہ قرار پایا۔ اس کے حکمراں کو "قیصر" کہا جاتا تھا۔

قسطنطین رومی پہلے بُت پرست تھے مگر قسطنطین (۲۷۴ء / ۳۳۷ء) کے زمانہ میں انھوں نے عیسائیت قبول کر لی اور یوروپ میں عیسائیت کا پیغام پہنچایا۔ عیسائی مذہب کا دینی مرکز بیت المقدس (ایلیا) انہی کی نگرانی میں تھا۔ اس لیے ان کو "محافظِ دینِ مسیحی" سمجھا جاتا تھا اور یوروپ میں ان کو بڑا اقتدار حاصل تھا۔ مشرقی روم کے زیرِ اقتدار ایشیائے کوچک و شام و فلسطین اور مصر کے علاقے بھی تھے۔ شامی علاقہ میں کئی عرب ریاستیں قائم تھیں جو اندرونی طور پر خود مختار تھیں مگر شہنشاہِ روم کو خراج ادا کرتی تھیں۔ ان ریاستوں نے بھی رومی حکومت کے اثرات سے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا۔ اسی لیے ان کو عرب مُستَعرِبہ کہا جاتا تھا۔

آغازِ اسلام میں رومی سلطنت کا تاجدار ہرقل تھا۔ یہ ۶۱۰ء سے ۶۴۱ء تک حکمراں رہا۔ یہ پہلے افریقہ کا گورنر تھا۔ پھر شہنشاہ فوکاس کے قتل کے بعد اسے بادشاہ بنا لیا گیا۔

---

[1] تاریخ قدیم از پروفیسر محمد اکمل ص ۱۵۳ و تاریخ الاسلام السیاسی از حسن ابراہیم ج ۱ ص ۱۶۶

رومی اور فارسی سلطنتوں کی سرحدیں آپس میں ملتی تھیں اور ہوسِ اقتدار دونوں کو ایک دوسرے سے ٹکراتی رہتی تھی۔ عراق و شام و مصر کے علاقے ان کے میدانِ جنگ بنتے تھے۔ طلوعِ آفتابِ اسلام سے کچھ پہلے رومیوں اور فارسیوں میں زبردست لڑائی ہوئی تھی۔ خسرو پرویز کی فوجوں نے قیصر فوقا کو شکست دے کر جزیرہ پر قبضہ کرلیا اور فینیقار اور فلسطین کو تہ و بالا کرتے ہوئے باسفورس تک پہنچ گئے۔ پھر قیصر ہرقل کے زمانہ میں انھوں نے بیت المقدس (یروشلم) پر قبضہ کرلیا اور وہاں سے عیسائیوں کی مقدس صلیب اٹھا لائے اور بہت سے عیسائی تبرکات برباد کردیے۔ پھر ۶۱۶ء میں مصر پر حملہ کرکے اسکندریہ پر قبضہ کرلیا۔

اس زمانہ میں، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو پانچ سال ہوئے تھے۔ اور مسلمان مکہ معظمہ میں قریش کے ہاتھوں مصیبتیں برداشت کررہے تھے۔ قریش چونکہ مشرک تھے اور ایرانی بھی، اس لیے وہ جذباتی طور پر ایرانیوں کے ہمدرد تھے اور مسلمان رومیوں کے اہلِ کتاب ہونے کی وجہ سے ان کے حامی۔ ایرانیوں کی فتوحات کی خبریں مکہ معظمہ پہنچیں تو قریش نے مسلمانوں کو چڑانے کے لیے اس پر خوشی منائی۔ مسلمان اس سے غمگین ہوئے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے، قرآنِ کریم کے اِن الفاظ میں مسلمانوں کو تسلی دی گئی:

غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِيْ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ وَعْدَ اللّٰهِ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (الروم)
30: 2-6

قریب کے ملک (شام) میں اس وقت رومی مغلوب ہوگئے ہیں مگر وہ چند ہی سال کے اندر مغلوب ہونے کے بعد غالب ہوجائیں گے اور اول و آخر اللہ ہی کا حکم چلتا ہے۔ اور اُس دن اللہ کی مدد کی وجہ سے مسلمان بھی خوش ہورہے ہوں گے۔ وہ جس کی چاہتا ہے، مدد کرتا ہے اور وہ عزت والا اور رحم والا ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے، اللہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا لیکن اکثر لوگ اسے نہیں جانتے۔

کچھ عرصہ تیاری کے بعد، قیصرِ روم ہرقل نے ۶۲۴ء میں ایرانیوں پر زبردست حملہ کیا اور ان کو شکستِ فاش دے کر نہ صرف اپنے مقبوضہ علاقے واپس لے لیے، بلکہ ان کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت ایک طرف رومی اپنی فتوحات پر شادیانے بجا رہے تھے تو دوسری طرف مسلمان بدر کے میدان میں قریش کے لشکر کو شکستِ فاش دے کر بارگاہِ خداوندی میں سجدۂ شکر ادا کر رہے تھے۔ پھر ۶۲۸ء میں جب شیرویہ تختِ فارس پر قابض ہوا۔ اس نے قیصر ہرقل سے صلح کر لی۔ اور رومیوں سے چھینی ہوئی صلیب اور دوسرے تبرکات واپس کر دیے۔ قیصر ہرقل اس عظیم کامیابی پر بہت خوش ہوا اور اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے، ۶۲۹ء میں بیت المقدس میں حاضری دی۔ یہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک اسے ملا، جسے اس نے عزت و احترام کے ساتھ وصول کیا، مگر افسوس کہ اپنے اُمرائے سلطنت کی مخالفت اور حکومت ہاتھ سے نکل جانے کے اندیشہ سے، اسلام قبول نہ کر سکا۔

آخر، اسی قیصر ہرقل کے زمانہ میں، حضرت فاروقِ اعظم کے عہد میں، لشکرِ اسلام نے شام و فلسطین کے علاقے فتح کر لیے اور رومی شہنشاہیت کا ایشیائی بازو ٹوٹ گیا۔

مورخینِ مغرب اور مسلم محققین نے رومی حکومت کے زوال کے اسباب سے بھی بحث کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اگرچہ رومیوں نے عیسائی مذہب چوتھی صدی عیسوی میں اختیار کر لیا تھا۔ مگر اسے بھی انھوں نے بُت پرستی کے سانچہ میں ڈھال لیا تھا۔ رومیوں کے گرجا حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کے علاوہ بے شمار فرشتوں کے بتوں سے بھرے رہتے تھے۔ عیسائی راہب اور نیں بظاہر تو پاکدامن بنتیں مگر ان کی خانقاہیں حرام کاری کا اڈہ بنی ہوئی تھیں۔ کفّارہ کے عیسائی عقیدہ نے ان کو ہر قسم کے گناہوں میں دلیر بنا دیا تھا۔ بقول ایس پی اسکاٹ اُن کے مذہبی پیشوا اتنے بداخلاق اور فاسق و فاجر ہو گئے تھے کہ اس کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اقتدار کی طلب میں وہ باہم دست و گریباں رہنے لگے اور دغا و فریب کی آلودگیوں میں پھنس گئے۔ ان کی دینی مجلسوں میں مخالفین کا خون بہایا جاتا تھا[1]

---

[1] ہسٹری آف دی مورس امپائر از ایس پی اسکاٹ (ترجمہ) ص ۶۵

امیروں اور عام لوگوں کے درمیان بھی معاشرت میں زمین و آسمان کا فرق تھا غلاموں کے ساتھ جانوروں کا سا برتاؤ کیا جاتا، سرکسوں میں ان کو خوفناک درندوں سے لڑاتے، پھر ان کو جانوروں کا لقمہ بنتے دیکھ کر خوش ہوتے۔ شام و مصر کے مقبوضہ علاقوں میں وہاں کے باشندوں پر گراں بار ٹیکس لگا رکھے تھے۔ قسطنطین نے قانون نافذ کیا تھا کہ اگر کسی یہودی سے کسی عیسائی کو مالی نقصان پہنچنے کا شبہ بھی ہو تو مشتبہ یہودیوں کو زندہ جلا دیا جائے۔ قانون بنایا گیا کہ یہودیوں کے ساتھ ذلت کا برتاؤ کیا جائے۔ ان کو اپنے تہوار منانے کی بھی اجازت نہ تھی۔ اس کا ردِّ عمل یہ ہوا کہ ہرقل کے زمانہ میں صور، فنیقیہ اور فلسطین کے یہودیوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے اپنے علاقہ میں رات کو عیسائیوں کا قتلِ عام کر دیا جائے۔ ایران و روم کی لڑائی میں جب ایرانیوں نے رومیوں کو شکست دی تو یہودیوں نے اسّی ہزار رومی قیدیوں کو ایرانیوں سے خرید کر ذبح کر دیا۔[1]

---

[1] محمد الشلبی الکامل مطبوعہ مصر ص ۵۴

آغازِ فتوحات

مُہمّاتِ عراق

مُرتدّین کا قلع قمع کرنے کے بعد، حضرت صدّیق اکبرؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو ایرانیوں کے مقابلہ کے لیے روانہ ہونے کا حکم دیا اور ہدایت کی کہ وہ اپنی مُہم کی ابتدا ایلہ کے مقام سے کریں۔ اور حضرت عیاضؓ بن غنمؓ کو حکم دیا کہ شمالی عراق کی طرف سے حملہ آور ہوں۔ اور مُثنّیٰؓ سے اپنی مہم کا آغاز کریں۔ انھیں یہ بھی حکم دیا گیا کہ وہ اپنے ساتھ مرتدین میں سے کسی کو نہ لے جائیں۔ کیونکہ حضرت عمرؓ کو اُن پر اعتماد نہ تھا۔ حضرت خالدؓ نے اسلامی قاعدہ کے مطابق ایرانی سرحد کے سپہ سالار ہُرمز کو خط لکھا کہ:

"اسلام قبول کرکے سلامتی کا راستہ اختیار کرو یا جزیہ دینا قبول کرو۔ اور ذمّی بن کر اسلامی حکومت کے زیرِ سایہ رہو۔ ورنہ تمہیں شرمندہ ہونا پڑے گا، کیونکہ میں ایسی قوم کو تمہارے مقابلہ کے لیے لایا ہوں جسے موت ایسی ہی پیاری ہے جیسی کہ تم کو زندگی"

پھر انھوں نے اپنے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کیا اور چشمۂ حُفیر پر سب کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ یہ چشمہ بصرہ کے محلِ وقوع پر واقع ہے۔

جنگِ کاظمہ ہُرمز کو حضرت خالدؓ کا خط ملا تو اس نے اسے کسریٰ کے پاس بھیجدیا اور اپنے لشکر کو جمع کرکے حفیر کی طرف روانہ ہوا۔ حضرت خالد بن ولید حفیر کی بجائے کاظمہ پہنچ کر فروکش ہوئے۔ ہرمز نے کاظمہ پہنچ کر مقابلہ پر صف آرائی کی۔ ایرانی لشکر نے اپنے پاؤں میں

زنجیریں باندھ لی تھیں تاکہ کوئی بھاگنے کا ارادہ نہ کرے۔ حضرت خالد نے ہرمز کو مُبارزت کے لیے للکارا۔ ہرمز مقابلہ پر آیا تو حضرت خالد نے اس کو زمین پر پٹخ دیا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ اس کے بعد لشکرِ فارس بھاگ کھڑا ہوا۔

جنگِ مَذار پھر حضرت خالد وہاں سے کوچ کر کے، بصرہ کے مقام پر پہنچے۔ کسریٰ نے ہرمز کی امداد کے لیے قارِنؓ بن قریانس کو ایک لشکر دے کر بھیج دیا تھا۔ مقام مذار پر اسے ہرمز کے مارے جانے کی خبر ملی۔ وہ اپنے لشکر کے ساتھ وہیں مقیم ہو گیا۔ حضرت خالد کو معلوم ہوا تو وہ وہاں پہنچے۔ دونوں لشکروں میں سخت مقابلہ ہوا۔ قارن سالارِ لشکر جلد ہی مارا گیا۔ اور اس کا لشکر بھاگ کھڑا ہوا۔ ۳۰ ہزار ایرانی قتل ہوئے اور بہت سے راستہ میں دریا میں غرق ہو گئے۔

جنگِ وَلَجَہ شہنشاہِ ایران کو اس شکست کی خبر پہنچی تو اُس نے اَنْدَرْگَر کے ماتحت ایک زبردست لشکر مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے روانہ کیا۔ اس نے مقام وَلَجَہ میں آکر قیام کیا۔ پھر دوسرا لشکر اس کی مدد کے لیے بہمن جادُوَیہ کی سرکردگی میں بھیجا۔ اس کے علاوہ بہت سے عیسائی عربی قبیلے بھی ان کے ساتھ آملے جو سلطنتِ ایران کے زیرِ اثر تھے۔ حضرت خالد کو جیسے ہی معلوم ہوا فوراً وَلجہ کی طرف کوچ کیا اور اپنے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ پہلے ایک حصہ کو لے کر حضرت خالد خود مقابلہ پر آئے۔ پھر کچھ دیر بعد، دوسرے لشکر کے تازہ دم ٹکڑے بھی دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ آخر ایرانیوں کو شکست فاش ہوئی اور ایرانی سپہ سالار بھاگ کھڑا ہوا۔ اور راستہ میں پیاسا مر گیا۔

جنگِ اُلَیس اس لڑائی میں عربی نصرانی قبیلہ بکر بن وائل کے بہت سے آدمی مارے گئے تھے۔ اس لیے یہ لوگ بھی بدلہ لینے کے لیے الیس کے مقام پر جمع ہوئے۔ اور بہمن جادویہ بھی وَلجہ سے اپنا بچا کھچا لشکر لے کر یہاں آگیا۔ حضرت خالد کو معلوم ہوا تو مجاہدینِ اسلام کو لے کر الیس کے مقام پر پہنچ

گئے۔ دونوں لشکروں میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ آخر مجاہدینِ اسلام نے دشمنوں کے قدم اکھاڑ دیے اور ہزاروں ایرانی مارے گئے۔ یہ واقعہ صفر ۱۲ھ کا ہے۔

فتحِ حیرہ

حضرت خالد الیس کے بعد انغیشیا پہنچے، انھوں نے مالِ غنیمت اور لشکر کا سامان دریائے فرات میں کشتیوں میں لاد دیا تھا۔ وہاں سے ان کا ارادہ "حیرہ" کا تھا جو عراق کے عرب حکمراں اور شہنشاہِ ایران کے باج گزار کا صدر مقام تھا۔ حیرہ کے حاکم کو جب حضرت خالد کی روانگی کا علم ہوا تو اس نے فرات کا پانی نہروں میں چھوڑ دیا۔ لشکرِ اسلام کی کشتیاں رُک گئیں۔ حضرت خالد کو معلوم ہوا تو فوراً حیرہ پہنچے، اور دریائے فرات کا پانی جاری کیا اور حیرہ کا محاصرہ کر لیا۔

حیرہ کے باشندوں نے مقابلہ کی طاقت نہ پائی اور ان کے سردار عمرو بن عبدالمسیح نے ایک لاکھ نوّے ہزار درہم سالانہ جزیہ پر مسلمانوں سے صلح کر لی اور شہنشاہِ ایران کی بجائے حکومتِ اسلامی کی ماتحتی قبول کی۔

"حیرہ" عراق عرب کا صدر مقام تھا۔ اس کی فتح کے بعد، عراق کے دوسرے رئیسوں نے بھی مسلمانوں سے صلح ہی میں سلامتی دیکھی۔ اور دو لاکھ درہم سالانہ پر صلح کا معاہدہ کر لیا۔

حضرت خالد نے اس فتح کی خوش خبری مدینہ منورہ بھیجی اور وہ تحفے تحائف بھی روانہ کیے جو عراقی رئیسوں نے اپنے مُلک کے دستور کے مطابق ان کو پیش کیے تھے۔ حضرت فاروقِ اعظم نے بارگاہِ خداوندی میں سجدۂ شکر ادا کیا اور تمام تحفے بیت المال میں داخل کر دیے۔

اس فتح کے بعد حضرت خالد نے مفتوحہ علاقوں میں افسرِ خراج مقرر کیے اور ملک کے انتظام کے لیے عامل مقرر کیے اور سرحدوں کی نگرانی کے انتظامات کیے۔

بادشاہ اور اُمراء کے نام خط

پھر حضرت خالد نے دو خط بھیجے۔ ایک شہنشاہِ فارس کے نام، دوسرا امراء

وزمینداران فارس کے نام۔ اِن خطوں کا مضمون یہ تھا کہ "یا اسلام لے آؤ اور ہماری جماعت میں شامل ہو جاؤ اور یا جزیہ ادا کرنا منظور کرو اور اسلامی حکومت کی ماتحتی قبول کرو، ورنہ ایک ایسی قوم سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ جسے موت زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔"

جس وقت یہ خط دربارِ ایران میں پہنچے ان میں باہمی سخت اختلافات چل رہے تھے۔ ان کو اپنے سرداروں کی شکست کی خبریں بھی مل رہی تھیں، بہت گھبرائے۔ اس وقت شہنشاہ اردشیر کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کے جانشین کا مسئلہ متنازع فیہ تھا۔ آخر انھوں نے اپنے اختلافات مٹائے اور فرّخ زاد کو عارضی شہنشاہ تجویز کیا اور عربوں کے مقابلہ کی تدبیریں کرنے لگے۔

فتح انبار حیرہ کے انتظامات مکمل کرنے کے بعد، حضرت خالد بن ولید نے شمالی عراق میں حضرت عیاض بن غنم کی مدد کے لیے روانہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ اور وہ انبار کی طرف روانہ ہو گئے۔ حیرہ میں انھوں نے قعقاع بن عمرو کو اپنا جانشین بنایا۔

انبار میں شیرزاد ایک بڑی فوج لیے پڑا تھا۔ اس نے شہر کی فصیل کے اردگرد دمدمے بنا لیے تھے اور خندق کھود لی تھی۔ جیسے ہی مسلمان فصیل کے قریب پہنچے، ایرانیوں نے ان پر زبردست تیر باری شروع کر دی۔ بہت سے مسلمانوں کی آنکھوں کو نقصان پہنچا۔ مگر حضرت خالد نے کمزور اونٹوں کو ذبح کر کر خندق کو ان سے پاٹ دیا۔ پھر فصیل کو پار کر کے شہر میں داخل ہو گئے۔ شیرزاد نے شہر حوالہ کر دیا اور اپنی جان بچا کر جزیرۂ خیبر میں پناہ گزیں ہوا۔

فتح عین التمر خالد بن ولید نے انبار پر قبضہ کر کے وہاں زبرقان بن بدر کو اپنا قائم مقام بنایا۔ پھر عین التمر کی طرف روانہ ہوئے۔ عین التمر میں مہران بن بہرام چوبین ایرانیوں کا زبردست لشکر لیے پڑا تھا۔ نمر، تغلب اور ایاد کے کئی عربی قبیلے بھی اس کی مدد کے لیے ساتھ تھے۔

عُقّہ بن ابی عقہ نے، جو اِن عربی قبائل کا سپہ سالار تھا، مہران سے کہا کہ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے۔ آپ پہلے ہمیں مسلمانوں کے لشکر سے نمٹ لینے دیجیے۔ مہران بخوشی راضی ہوگیا۔ چنانچہ فرزندانِ اسلام اور ایران کے زیرِ اثر عرب قبیلے ایک دوسرے سے سُبُکدوش آزما ہوئے۔ حضرت خالد نے عقہ بن ابی عقہ کو زندہ گرفتار کرلیا۔ عرب قبیلے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان کو دیکھ کر ایرانی لشکر کے بھی پاؤں اکھڑ گئے اور مہران نے بھی راہِ فرار اختیار کی۔ مسلمانوں نے قلعہ پر قبضہ کرلیا اور وہاں جو بچا کھچا ایرانی و عربی لشکر موجود تھا اس کا قلع قمع کیا۔

عین التمر میں ایک عیسائی دینی تعلیم کا مدرسہ تھا۔ وہاں چالیس بچے انجیل کی تعلیم پا رہے تھے، ان کو مسلمانوں نے اپنی نگرانی میں لے لیا۔ ان میں موسیٰ بن نصیر فاتحِ اندلس کے والد نصیر اور مشہور عالمِ تعبیر ابو محمد بن سیرین کے والد سیرین بھی تھے۔

فتح دومۃ الجندل

عین التمر میں حضرت خالد کو عیاض بن غنم کا خط ملا۔ انھوں نے حضرت خالد کو اپنی مدد کے لیے دومۃ الجندل (شمالی عراق) میں بُلایا تھا وہ فوراً روانہ ہوگئے۔ دومۃ الجندل میں نصرانی عرب قبیلوں کا بہت بڑا لشکر جمع تھا۔ ان کا ایک سردار اکیدر بن عبد الملک بھی تھا، جو زمانۂ رسالت میں حضرت خالد کے ہاتھوں گرفتار ہوکر مدینہ آیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیہ کی ادائگی کی شرط پر اسے رہا فرما دیا تھا۔ مگر بعد میں وہ اپنے عہد سے پھر گیا تھا۔

اکیدر نے عرب سرداروں سے کہا کہ میں خالد بن ولید کو خوب جانتا ہوں، تم ان کے سامنے ٹھہر نہیں سکتے۔ بہتر یہ ہے کہ مُصالحت کرلو۔ مگر وہ نہ مانے اور اکیدر اُن کو چھوڑ کر چلا گیا مگر راستہ میں لشکرِ اسلام کے کسی دستہ سے مقابلہ ہوا اور مارا گیا۔

حضرت خالد عین التمر پہنچے، وہاں عرب قبیلوں کے سالار جودی بن ربیعہ سے

دومۃ الجندل

مقابلہ ہوا۔ ایک طرف سے عیاض بن غنم نے اپنی فوجیں بڑھائیں اور دوسری طرف سے حضرت خالد نے۔ جودی کا لشکر بھاگ کھڑا ہوا اور وہ خود زندہ گرفتار ہوا۔ مسلمانوں نے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔

حیرہ کو واپسی دومۃ الجندل کی فتح کے بعد، حضرت خالد بن ولید فوراً ہی حیرہ کی طرف لوٹے۔ ایرانیوں کو جب حضرت خالد کی دومۃ الجندل کی طرف روانگی کا علم ہوا تو انھوں نے حیرہ کو واپس لینے کی کوشش شروع کر دی۔ اور دو ایرانی افسروں رُزویہ اور زُرمِہر کی سرکردگی میں بہت بڑا لشکر روانہ ہوا۔ اور حصید اور خَنافِس کے مقام پر جمع ہوا۔ قعقاع نے خنافس کی طرف تو ابو لیلیٰ کو روانہ کیا اور خود حصید میں ایرانیوں کے مقابلہ پر آئے۔ دونوں جگہ لشکرِ اسلام کو کامیابی ہوئی۔ اور ایرانیوں کے دونوں سردار مقتول ہوئے۔

حضرت خالد بن ولید حیرہ آئے تو معلوم ہوا کہ مصیخ میں عیسائی عربوں کی بہت بڑی جماعت مقابلہ کے لیے جمع ہو رہی ہے۔ آپ فوراً مُصیخ پہنچے اور دشمن کے لشکر کو شکستِ فاش دی۔

پھر اس کے بعد ثنی اور زمیل کے مقامات پر جہاں شام، عراق اور جزیرہ کی سرحدیں ملتی ہیں، عیسائی عربوں اور ایرانیوں سے کئی مقابلے ہوئے جن میں مسلمان ہی کامیاب ہوئے۔

جنگِ فراض یہیں مقامِ فراض پر ایرانیوں اور عرب عیسائیوں کے ساتھ رومیوں کا بھی ایک متحدہ عظیم الشان لشکر مقابلہ پر آیا۔ دریائے فرات کے کنارہ مقابلہ ہوا۔ دشمن تعداد کے اعتبار سے مسلمانوں سے کئی گنا تھا اور مسلمان تھکے ہوئے بھی تھے۔ مگر مجاہدینِ اسلام نے دشمنوں کے چھکے چھڑا دیے آخر وہ ایک لاکھ مقتول چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اور لشکرِ اسلام کو فتح نصیب ہوئی۔ یہ واقعہ ۲۵ ذی قعدہ ۱۲ھ کا ہے۔

حجِ بیت اللہ

اب آپ نے لشکرِ اسلام کو حیرہ جانے کا حکم دیا اور خود خفیہ طور پر حجِ بیت اللہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ اہلِ لشکر یہی سمجھتے رہے کہ آپ ساقہ (لشکر کے پچھلے حصہ) میں ہیں آپ غیر معروف راستہ کو رات دن تیزی سے قطع کرتے ہوئے اس قدر جلد حج سے فارغ ہوکر واپس ہوئے کہ لشکرِ اسلامی ابھی حیرہ پہنچا بھی نہ تھا۔ اور حیرہ میں لشکر کے ساتھ داخل ہوئے۔ حضرت ابوبکر کو آپ کے اِس خطرناک اِقدام کا حال معلوم ہوا تو ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

حضرت خالد کے کارنامے

حضرت خالد بن ولید نے عراق کے میدانوں میں، محرم سنہ ۱۲ھ سے صفر سنہ ۱۳ھ تک ایک سال دو ماہ گزارے۔ اس دوران میں ان کو دشمنانِ اسلام سے بہت سی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ ان لڑائیوں میں بعض مقامات پر ایرانیوں، رومیوں اور عرب عیسائی قبیلوں تینوں کی مشترکہ فوجوں سے مقابلہ کرنا پڑا، مگر ہر جگہ فتح نے ان کے قدم چومے۔ حالت یہ تھی کہ میدانِ جنگ میں ان کے پہنچنے سے پہلے ہی ان کا نام سُن کر دشمنوں کی ہمتیں ٹوٹ جاتی تھیں۔ انھوں نے اس تھوڑی سی مدت میں اُبلہ سے فراض تک دریائے فرات کا ساحلی علاقہ ایرانی سلطنت سے جدا کرلیا۔

وہ جو علاقہ فتح کرتے، اُس کے تحفظ کا پورا انتظام کرتے۔ وہاں اپنا حاکم مقرر کردیتے جو وہاں کے انتظامات کا ذمہ دار ہوتا اور ایک افسرِ خراج مقرر کردیتے جو اہلِ ذمہ سے ٹیکس وصول کرنے کا ذمہ دار ہوتا۔

وہ عام رعایا خصوصاً کسانوں سے نرمی اور مہربانی کا برتاؤ کرتے، اُن کے حقوق کی ادائگی کی نگرانی رکھتے۔ ایرانی امیروں اور افسروں کی طرح ان کو

حقیر و ذلیل نہ سمجھتے۔ اِس کے برخلاف میدانِ جنگ میں اپنے حریفوں کے ساتھ برتاؤ سخت ہوتا۔ جب دشمن کی فوج مقابلہ پر آتی تو سب سے پہلے وہ خود آگے بڑھتے۔ اور دشمن کے سپہ سالار کو مُبارزت کے لیے طلب کرتے۔ بڑے سے بڑا بہادر بھی چند منٹ میں زمین پر تڑپتا نظر آتا، اور سالارِ لشکر کے قتل کے بعد لڑائی زیادہ طول نہ کھینچتی۔

حضرت خالد بن ولید کی یہ کامیابیاں اسلامی فتوحات کی پیشانی کا نور ہیں، مگر اس نور کا منبع حضرت صدّیقِ اکبرؓ کی فراست و بصیرتِ ایمانی ہے۔ عراق و شام کے میدانوں کی معرکہ آرائیوں کا نقشہ مسجدِ نبوی میں مرتب ہوتا۔ اور صدیقِ اکبر قدم قدم پر، حضرت خالد کی رہنمائی فرماتے رہتے۔ اگر ان سے کوئی غلطی ہوتی تو فوراً ان کو ٹوکتے۔ اور فتح ہوتی تو بتاتے کہ وہ اپنی کامیابیوں کو اسلام کی طاقت اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا نتیجہ سمجھیں۔ اِس سلسلہ میں حضرت صدیقِ اکبر کے خطوط تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔

مُہماتِ شام

حضرت صدیق اکبرؓ نے ۱۲ھ کے آخر میں عراق کے اکثر حصہ پر اسلام کا جھنڈا لہرائے جانے کے بعد، شام و فلسطین کی طرف توجہ کی۔ آپ نے شامی علاقہ کی فتح کے لیے لشکرِ اسلام کو چار حصوں میں تقسیم فرمایا۔ اور ہر حصہ کا ایک مستقل سردار اور اس کے لیے مخصوص حدود مقرر فرما دیں۔

چنانچہ حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کو حمص کی طرف، حضرت عمرو بن العاص کو فلسطین کی طرف، حضرت یزید بن ابی سفیان کو دمشق کی طرف اور حضرت شرحبیل بن حسنہؓ کو اردن کی طرف روانہ کیا۔

اس لشکر کی مجموعی تعداد چھتیس ہزار تھی۔ اسلامی لشکر کے چاروں سردار اپنی اپنی جمعیت کو لے کر اپنے اپنے متعین مقام پر پہنچے۔

جنگِ یرموک

شہنشاہِ روم ہرقل اس زمانہ میں مسلمانوں سے مقابلہ کے لیے حمص آیا ہوا تھا۔ اس کو یہ توقع نہ تھی کہ بجائے اُس کے عرب پر حملہ آور ہونے کے، خود مسلمان اس کے ملک پر حملہ آور ہو جائیں گے۔ اس کو یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلامی لشکر چار حصوں میں تقسیم ہے۔ اس نے بھی اپنے عظیم الشان لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کیا اور ہر حصہ کو جو مسلمانوں کے لشکر کی ہر ٹکڑی سے آٹھ گنا تھا، لشکرِ اسلامی کے مقابلہ کے لیے مختلف اطراف میں بھیج دیا۔ سپہ سالارانِ اسلام کو معلوم ہوا تو انھوں نے حضرت عمرو بن عاص کے مشورہ سے طے کیا کہ پورا اسلامی لشکر ایک جگہ جمع ہو جائے ورنہ اندیشہ تھا کہ الگ الگ ٹکڑیاں کامیاب نہ ہو سکیں گی۔ حضرت ابو بکرؓ کو اطلاع

دی گئی تو انھوں نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا۔ ہرقل کو یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے بھی اپنی عظیم الشان فوج کو جس کی تعداد دو لاکھ چالیس ہزار تھی، یکجا ہونے کا حکم دیا۔ چنانچہ نہرِ یرموک کے کنارہ حمام اعلا و قوصہ پر رومی فوج خیمہ زن ہوئی۔ مجاہدینِ اسلام بھی ان کے مقابلہ پر صف آرا ہو گئے۔ لشکرِ روم کی پشت پر پہاڑ تھا اور سامنے دریا، اور دریا کے دوسرے کنارہ پر اسلامی فوج۔ اس لیے رومی مقامِ واقوصہ میں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔

حضرت خالد کی آمد صفر ۱۳ھ سے ربیع الآخر ۱۳ھ تک دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابلہ پر پڑے رہے۔ اُمرارِ اسلام نے دشمن کی غیر معمولی کثرتِ تعداد کی وجہ سے حضرت صدیق اکبر سے مزید فوجی امداد کی درخواست کی۔

حضرت ابوبکر نے بھی موقعہ کی نزاکت کو محسوس کیا۔ خدانخواستہ اگر یہاں دشمن غالب آجاتا تو مسلمان سلامت نہیں نکل سکتے تھے۔ اس لیے آپ نے حضرت خالد بن ولید کو لکھا کہ وہ عراق کی کمان مثنیٰ بن حارثہ کو دے دیں اور خود لشکرِ شام کی مدد کے لیے جلد از جلد یرموک پہنچیں۔

چنانچہ حضرت خالد بن ولید دس ہزار مجاہدین کو ساتھ لے کر حیرہ سے ملکِ شام کی طرف روانہ ہو گئے۔

عراق و شام کے درمیان مختلف مقامات پر حضرت خالد کی دشمنوں سے ٹکر ہوئی۔ مگر وہ ارک، تدمر، قریتین، مرج راہط، غوطہ، بصریٰ ہر جگہ فتح کے پرچم اڑاتے ہوئے اور دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھاتے ہوئے ربیع الآخر میں یرموک پہنچ گئے۔ شاہِ روم کو معلوم ہوا تو اس نے بھی اپنی فوج کو مزید کمک بھیج دی۔ رومی لشکر کا سپہ سالار شہنشاہِ روم کا بھائی تذارق تھا۔

لشکرِ اسلام کی تنظیم حضرت خالد نے ایک ماہر جنگ کی حیثیت سے جنگی حالات کا جائزہ لیا۔ آپ نے دیکھا کہ دشمن کی

فوج تعداد کے لحاظ سے تو کہیں زیادہ ہے ہی، وہ فوجی لحاظ سے بھی منظّم اور مُرتّب ہے۔ آپ نے چاروں سرداران لشکر کو سمجھایا کہ ہم میں سے ہر ایک باری باری پورے لشکر کا سپہ سالار ہو۔ سب نے اسے منظور کیا اور پہلے دن خود حضرتِ خالد سپہ سالار ہوئے۔ حضرت خالد نے کُل فوج کو اڑتیس ۳۸ دستوں پر تقسیم کیا۔ اور ہر دستہ کا افسر الگ الگ مقرر کیا۔ پھر پوری فوج کو قلب، میمنہ، میسرہ اور ساقہ کے حصوں میں تقسیم کرکے چاروں اُمرار کے ماتحت کیا۔ خود ان کی حیثیت سپہ سالارِ اعلیٰ کی رہی۔ ابوسفیان نقیب لشکر مقرر ہوئے۔

مُقابلہ آخر رومی لشکر کی طرف سے چالیس ہزار کے ایک دستہ نے مسلمانوں پر سخت حملہ کیا۔ اپنی عادت کے مطابق حضرت خالد اپنے ساتھیوں کو لے کر قلبِ لشکر میں پہنچ گئے۔ جدھر وہ نکل جاتے دشمن کا لشکر کائی کی طرح پھٹتا جاتا۔

رومی پادری صلیبیں ہاتھ میں اٹھائے ہوئے تھے اور انجیل کی آیتیں بلند آواز سے پڑھ کر اپنے آدمیوں کو جوش دلا رہے تھے۔

لشکرِ اسلام میں ابوسفیان ہر ہر دستہ کے سامنے کھڑے ہو کر تقریر کر رہے تھے اور مسلمانوں کو جوش دلا کر جاں فروشی پر آمادہ کر رہے تھے۔

کسی مسلمان نے دشمنوں کی کثرت دیکھ کر کہا "رومی کتنے زیادہ ہیں اور مسلمان کتنے کم!" حضرت خالد نے سنا تو فرمایا "مسلمان کتنے زیادہ ہیں اور رومی کتنے کم۔ لشکر کی زیادتی اور کمی تعداد پر نہیں بلکہ فتح و شکست پر موقوف ہے۔"

حضرت عکرمہ بن ابی جہل نے لڑتے ہوئے چیخ کر کہا "کون میرے ہاتھ پر موت کی بیعت کرتا ہے؟" کچھ بہادر نکلے اور ان کے ہاتھ پر مرنے کی بیعت کی۔ پھر دشمن کے ہجوم میں گھس گئے اور شہادت حاصل کی۔ حضرت عکرمہ اور ان کے فرزند عمر بن عکرمہ بھی راہیِ جنت ہوئے۔

فتح رومیوں کے لیے بھاگنے کا راستہ نہ تھا۔ وہ بھی بہت بہادری سے لڑے۔

لڑائی صبح سے شروع ہو کر لگاتار شام تک چلتی رہی۔ فرزندانِ اسلام نے ظہر اور عصر کی نمازیں میدانِ جنگ میں پڑھیں اور بارگاہِ خداوندی میں پیشانی رکھ کر خشوع و خضوع کے ساتھ کامیابی کی دعا مانگی۔ آخر رومیوں پر شکست کے آثار طاری ہوئے اور وہ پیچھے ہٹنے لگے۔ مجاہدینِ اسلام ان کو دباتے ہوئے پہاڑ کے دامن تک لے گئے۔ مگر وہ جاتے کہاں، پیچھے پہاڑ تھا اور آگے دریائے فرات۔ ہزاروں بہادرانِ اسلام کے ہاتھوں لقمۂ موت بنے، ہزاروں دریائے فرات میں غرق ہوئے۔ کچھ کسی طرح جان بچا کر نکل بھاگے۔ اس لڑائی میں رومی مقتولوں کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار اور شہدائے اسلام کی تین ہزار تھی۔

حضرت خالد کی معزولی

یرموک کی لڑائی ابھی جاری ہی تھی کہ مدینہ منورہ سے قاصد آیا اور اس نے حضرت صدیقِ اکبر کی وفات اور حضرت عمر فاروق کے خلیفہ مقرر ہونے کی اطلاع دی۔ اس نے حضرت خالد بن ولید کو یہ اطلاع بھی دی کہ نئے خلیفہ نے ان کو لشکرِ اسلام کی سالاری سے معزول کر دیا ہے۔ اور اس منصب پر حضرت ابو عبیدہ بن الجرّاح کو مقرر فرمایا ہے۔

حضرت خالد اس خط کو پڑھ کر ذرا بد دل نہ ہوئے اور اسے خاموشی کے ساتھ حضرت ابو عبیدہ کے حوالہ کر دیا اور ان سے بھی کہہ دیا کہ وہ اسے اپنے ہی تک رکھیں، تاکہ فوج میں اضطراب و اختلاف پیدا نہ ہو۔ یوں میں آج سے آپ کا ماتحت ہوں۔

کسی نے حضرت خالد سے پوچھا: اپنی معزولی کی خبر سن کر آپ کے حملوں کی شدت میں ذرا فرق نہ آیا؟ حضرت خالد نے جواب دیا: میں اللہ کے لیے لڑ رہا تھا، حضرت صدیقِ اکبر کے لیے نہیں۔

پھر فرمایا: تمام تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ابو بکر صدیق کو وفات دی، وہ مجھے عمر فاروق کے مقابلہ میں زیادہ محبوب تھے۔

بعد میں ایک موقعہ پر جب حضرت خالد فاروقِ اعظم کی خدمت میں آئے اور ان

سے اس بات کی شکایت کی تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں کسی کوتاہی کی وجہ سے تبوک کی سپہ سالاری سے نہیں ہٹایا تھا، بلکہ بات یہ تھی کہ تمہاری عراق کی مسلسل فتوحات کی وجہ سے لوگ سمجھنے لگے تھے کہ اس میں تمہاری جنگی مہارت کو دخل ہے۔ میں انھیں بتانا چاہتا تھا کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور اسلام کی طاقت کی وجہ سے ہے۔ کسی خاص شخص کی ذات کی وجہ سے نہیں۔

وفاتِ صدّیقِ اکبرؓ

۷ جمادی الاخریٰ ۱۳ھ کو حضرت صدّیقِ اکبرؓ کو بخار آیا اور تقریباً نصف ماہ بیمار رہ کر ۲۱ جمادی الاخریٰ کو راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ جب بیماری بڑھی اور مسجد میں جانے سے معذور ہوئے تو حضرت عمر فاروقؓ کو امامت کے فرائض سپرد کیے۔ جب اپنی زندگی سے مایوسی ہوئی تو صحابۂ کرام کو بلاکر اپنے جانشین کے متعلق مشورہ کیا۔ عراق و شام میں لڑائیاں جاری تھیں اور دشمنانِ اسلام موقعہ کے منتظر تھے۔ اگر اس وقت مسلمانوں میں اندرونی اختلاف ہو جاتا تو اسلام کا مستقبل خطرہ میں پڑ جاتا۔ اس لیے دنیا سے رخصت کے وقت اِس اہم مسئلہ کو طے فرما دینا مناسب سمجھا۔ اور اپنی رائے حضرت فاروقؓ کے متعلق ظاہر کی۔ جو اکابر صحابہ وہاں موجود تھے ان میں سے اکثر نے اس کی تائید کی۔ مگر بعض نے ان کے مزاج کی سختی کی شکایت کی۔ حضرت صدّیقِ اکبرؓ نے فرمایا: جب ان پر خلافت کا بار پڑے گا تو وہ خود نرم ہو جائیں گے۔ ان کی سختی اسی وقت تک ہے جب تک وہ آزاد ہیں۔

اس کے بعد حضرت عثمانؓ کو بلاکر عہد نامۂ خلافت لکھوایا، جس کا خلاصہ یہ ہے:

"یہ وہ عہد نامہ ہے جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ابوبکرؓ نے

اس وقت لکھوایا جب وہ دنیا سے رخصت ہو رہا تھا اور آخرت کی منزل میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کافر بھی ایمان لے آتا ہے اور فاجر بھی گناہوں سے باز آجاتا ہے۔ مسلمانو! میں نے تم پر عمر بن الخطاب کو حاکم مقرر کیا ہے۔ اگر انھوں نے نیکی اور انصاف کا راستہ اختیار کیا تو یہ میری رائے اور توقع کے مطابق ہوگا۔ اور اگر انھوں نے ظلم کیا اور میری رائے کے خلاف کیا تو میں عالم الغیب نہیں۔ میں نے تو مسلمانوں کی بھلائی ہی کا ارادہ کیا ہے۔"

پھر حکم دیا کہ اسے مجمعِ عام میں پڑھ کر سنا دیا جائے، خود بالاخانہ پر گئے۔ اور حاضرین سے، جو اِدھر اُدھر جمع تھے، فرمایا: میں نے اپنے کسی عزیز یا بھائی کو اپنا جانشین نہیں بنایا ہے، بلکہ مسلمانوں میں سے انتخاب کر کے بہترین شخص کو خلیفہ تجویز کیا ہے۔ تم لوگوں کی کیا رائے ہے؟ سب نے اس کو پسند کیا اور حضرت صدیقِ اکبر کی تجویز کی تائید کی۔ پھر حضرت عمر کو بلا کر مفید نصیحتیں کیں۔

پھر خانگی معاملات کی طرف توجہ فرمائی۔ اور حضرت عائشہ سے کہا: میرے پاس ایک باندی اور دو اونٹوں کے سوا کچھ نہیں۔ میرے مرنے کے بعد ان کو عمر کے پاس بھیج دینا۔ ان کے علاوہ اگر کوئی اور چیز ہو تو اسے بھی بھیج دینا۔ پھر کفن کے متعلق فرمایا کہ جو کپڑا میرے بدن پر ہے اسی کو دھو کر اس میں کفنا دینا۔ حضرت عائشہ نے عرض کیا: یہ کپڑا تو بہت پرانا ہے۔ آپ نے فرمایا، زندہ لوگ مرنے والوں کی نسبت نئے کپڑوں کے زیادہ حقدار ہیں۔

۲۱ جمادی الاخریٰ ۱۳ھ کی شام کو ترسٹھ سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ رات ہی کو غسل دیا گیا۔ حضرت فاروقِ اعظم نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور حضرت عائشہ کے حجرہ میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن کیے گئے۔ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ۔

عہدِ خلافت کے کارناموں پر ایک نظر

۱۹۱۶ء

حضرت صدّیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو صرف سوا دو سال کی مختصر مدت، خلافت کی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے میسر آئی۔ مگر اس مختصر مدت میں ضعفِ پیری کے باوجود آپ نے کئی ایسی اہم خدمات انجام دیں جن سے اسلام کی قوت و عظمت کی بنیادیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مستحکم ہو گئیں۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب مسلمانوں کی نگاہوں میں دنیا تاریک ہو رہی تھی، اندرونی اور بیرونی دشمنانِ اسلام نے خود عرب کی سرزمین میں اور اس کی سرحدوں پر فتنوں اور فسادات کے شعلے بھڑکا رکھے تھے۔ کچھ وہ لوگ تھے جنھوں نے فتحِ مکہ کے بعد اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کے آگے سر جھکا دیا تھا۔ مگر ان کے دل اسلام کی روشنی سے منور نہ ہوئے تھے، حضور کی وفات کے بعد انھوں نے حکومتِ اسلامیہ کی اطاعت کا حلقہ اپنی گردن سے اُتار پھینکا۔ کچھ وہ لوگ تھے جنھوں نے زکوٰۃ کو، جو اسلام نے امراء و غربا کے درمیان دولت کا توازن برقرار رکھنے کے لیے فرض کی تھی، جابرانہ ٹیکس سمجھا اور اسے ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ کچھ اقتدار کے بھوکے وہ لوگ تھے، جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم کامیابی کو دیکھ کر حضور کے بعد نبوت کا دعویٰ کر دیا اور یہ سمجھا کہ یہ ڈھونگ رچا کر وہ بھی سیاسی اقتدار حاصل کر سکتے ہیں، اُدھر شہنشاہِ روم نے، جس کی ساکھ کو تبوک کی پسپائی سے زبردست دھکا لگا تھا، مدینہ منورہ پر حملہ کر کے اپنی عزت کو بحال کرنے کا یہ بہترین موقعہ سمجھا۔

حضرت صدّیقِ اکبر نے بے مثال جرأت و شجاعت سے کام لے کر پہلے اندرونی فتنوں

کا انسداد کیا۔ پھر بیرونی طاقت ور دشمنوں کی طرف توجہ فرمائی۔ اور ان کی رہنمائی میں مجاہدینِ اسلام نے قیصر و کسریٰ کی سرحدوں میں گھس کر ان کے بہت سے زرخیز علاقوں کو مملکتِ اسلامی میں شامل کر لیا۔ ان کی وفات کے وقت ایک طرف سلطنتِ فارس کے صوبہ عراق کے صدر مقام حیرہ پر اسلام کا جھنڈا نصب ہو چکا تھا، تو دوسری طرف نہرِ یرموک کے کنارے ۳۶ ہزار سرفروشانِ اسلام رومی شہنشاہیت کے دو لاکھ چالیس ہزار بہادروں کے چھکے چھڑا رہے تھے۔

مملکتِ اسلامی کے تحفظ و توسیع کے بعد آپ کا ایک اور اہم کارنامہ قرآنِ کریم کا تحفظ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآنِ کریم صحابۂ کرام کے حافظوں میں محفوظ ہونے کے علاوہ الگ الگ اجزاء کی شکل میں لکھا ہوا تھا، مگر ایک جگہ مُصحَف کی
70 شکل میں مُرتّب نہ تھا۔ یمامہ کی لڑائی میں جب (ستر سو) حُفّاظِ قرآن شہید ہوئے تو حضرت فاروقِ اعظم کے مشورہ سے آپ نے بقیہ حافظوں اور کاتبوں کو جمع کر کے پورے قرآنِ کریم کو ایک مصحف کی شکل میں جمع کر کے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔

حضرت ابوبکر کا قبولِ اسلام کے وقت مکہ کے بڑے تاجروں میں شمار ہوتا تھا۔ ان کے پاس نقد چالیس ہزار درہم موجود تھے، انھوں نے اپنی ساری دولت راہِ خدا میں صرف کر دی۔ سات غلاموں کو اپنے مال سے، کافروں کے ہاتھ سے آزاد کرایا۔ اور غزوۂ تبوک کے موقعہ پر اپنے گھر کا سامان تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لا کر پیش کر دیا۔ خلافت کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد بعض صحابہ کے اصرار سے معمولی وظیفہ لینا قبول کیا۔ مگر انتقال کے وقت وصیت کی کہ ان کا باغ بیچ کر بیت المال کی رقم واپس کر دی جائے۔

ان کی صاحبزادی حضرت عائشہ تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چہیتی بیوی ہی تھیں، ان کے دوسرے اہلِ خاندان بھی اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی خدمت کے لیے وقف تھے، ہجرت کے اہم موقعہ پر اس کا سارا انتظام ان ہی نے کیا تھا۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لَيْسَ مِنَ النَّاسِ اَحَدٌ اَمَنَّ عَلَيَّ فِي نَفْسِهٖ وَمَالِهٖ مِنْ اَبِي بَكْرٍ

جان و مال کو فدا کرنے کے لحاظ سے، ابوبکر سے زیادہ مجھ پر کسی کا احسان نہیں ہے

قرآن فہمی میں آپ کو بڑا کمال حاصل تھا۔ جب سورۂ نصر (اذا جاء) اُتری تو آپ رونے لگے۔ صحابہ کو اس پر تعجب ہوا کہ اس سورہ میں تو اللہ کی مدد اور اسلام کی فتح اور کافروں کے قبولِ اسلام کا ذکر کر کے حضور کو شکرانہ کے طور پر تسبیح و استغفار کا حکم دیا گیا ہے۔ اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ ان سے وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا اشارہ ہے۔ کیونکہ جب آپ کی بعثت کا مقصد پورا ہو گیا تو آپ دنیا میں کیوں رہیں گے؛ چنانچہ یہی ہوا۔ جلد ہی آپ کی وفات ہو گئی۔

آپ کی انہی صفات و کمالات کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیماری کے زمانہ میں آپ کو مسجدِ نبوی کی امامت میں اپنا قائم مقام بنا دیا۔ اور آپ کی وفات کے بعد صحابۂ کرام نے آپ کا خلیفہ اور جانشین تجویز کیا۔

رضی اللہ عنہ

خاندانِ ابوبکر حضرت ابوبکر صدیق نے مختلف اوقات میں چار نکاح کیے۔ ان کی بیویوں اور ان کی اولاد کی تفصیل یہ ہے:

(۱) قُتیلہ بنت عَبْدُ الْعُزّیٰ۔ ان سے ایک فرزند عبداللہ اور ایک صاحبزادی اسماء پیدا ہوئیں۔ اسماء کی شادی حضرت زُبَیْر بن العوّام سے ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن زبیر ان ہی کے بیٹے تھے۔

(۲) اُمِّ رُومان بنت عامر۔ ان سے حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر پیدا ہوئے۔

(۳) اسماء بنت عُمَیْس۔ یہ حضرت جعفر بن ابی طالب کی بیوہ تھیں، ان سے ایک بیٹے محمد پیدا ہوئے۔

(۴) حبیبہ بنت خارجہ۔ ان سے حضرت ابوبکر کی وفات کے بعد ایک بیٹی ام کلثوم پیدا ہوئیں۔

عہدِ خلافتِ فاروقی

حالاتِ قبلِ خلافت

آپ کا نام عمر ہے، کُنیّت ابوحفص ہے اور فاروق لقب، والد کا نام خطّاب ہے اور والدہ کا حنتمہ۔ آپ کا خاندانی سلسلہ آٹھویں پُشت میں کعب بن لوئی پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے جا ملتا ہے۔ کعب کے ایک بیٹے عدی تھے جو حضرت عمرؓ کے اَجداد میں تھے اور دوسرے مُرّہ، جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں تھے۔ قبائل عرب کے جھگڑوں کا فیصلہ اور مُلکی معاملات کی سفارت آپ کے خاندان میں عدی بن کعب کے زمانے سے چلی آ رہی تھی۔

حضرت عمرؓ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے تیرہ سال بعد پیدا ہوئے۔ آپ نے عرب کے شرفاء کے دستور کے مطابق، سپہ گری، پہلوانی، تقریر اور نسب دانی میں مہارت پیدا کی اور لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیا جس کا عرب میں کم رواج تھا۔ آپ اپنے مزاج کے اعتبار سے بہادر، جَری اور جس بات کو حق سمجھتے اس کے کہنے میں بے باک تھے۔ عرب کے دوسرے سمجھدار نوجوانوں کی طرح آپ نے تجارت کا مشغلہ اختیار کیا اور اس سلسلہ میں دور دور کے ملکوں کے سفر کیے۔ ان سفروں میں دولت کمانے کے علاوہ آپ نے علم اور تجربہ بھی حاصل کیا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منصب رسالت پر فائز ہوئے تو آپ کی عمر ستائیس سال کی تھی۔ آپ اپنے بزرگوں کے منصبِ سفارت اور منصفی پر مامور تھے اور آپ کا شمار سردارانِ عرب میں ہوتا تھا۔ شروع میں دوسرے سردارانِ عرب کی طرح آپ نے بھی دعوتِ اسلام کو قبول نہ کیا، بلکہ اس کی مخالفت اور مُزاحمت کی۔

ابتدائے اسلام میں، مسلمانوں کو جن لوگوں کے ہاتھ سے سخت تکلیفیں برداشت

کرنی پڑیں ان میں ابو جہل وغیرہ کے علاوہ آپ بھی تھے۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ:

"اے اللہ، ابو جہل یا عمر بن خطاب میں سے کسی ایک کے ذریعہ اسلام کو عزت دے"

آخر یہ دولت، حضرت عمر کے حصہ میں آئی۔ ان کے قبولِ اسلام کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ یہ ایک دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کے ارادہ سے گھر سے نکلے۔ راستہ میں نعیم بن عبد اللہ مل گئے۔ اور ان کے تیور دیکھ کر پوچھا "اے عمر، کہاں جا رہے ہو"، انھوں نے جواب دیا کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کرنے جا رہا ہوں"۔ انھوں نے بڑا فتنہ پھیلایا ہے، نعیم نے کہا "پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو، تمہاری بہن فاطمہ اور بہنوئی سعید بن زید مسلمان ہو چکے ہیں۔ یہ سُن کر حضرت عمر رضؓ کو سخت غصہ آیا اور سیدھے اپنی بہن کے گھر پہنچے وہ اور ان کے شوہر، خباب بن الارتؓ سے قرآن پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمر نے اپنی بہن اور ان کے شوہر کو بے تحاشا مارنا شروع کر دیا اور اتنا مارا کہ جسم لہولہان ہو گیا۔ مگر اس اللہ کی بندی پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا اور کہنے لگیں "اے عمر تمہارا جو جی چاہے کر لو، اسلام تو اب ہمارے دل سے نہیں نکل سکتا"۔ حضرت عمر رضؓ پر اُن کی اس استقامت کا بڑا اثر ہوا۔ اپنی بہن سے قرآنِ کریم کے اوراق لیے۔ سورۂ طٰہٰ کی آیتوں پر نظر پڑی تو پکار اٹھے "اس کلام مبارک کے کیا کہنے"، پھر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دارِ ارقم بن ابی ارقم میں حاضر ہوئے اور اعلانِ اسلام کیا۔ ان کے اسلام لانے پر حضور اور آپ کے صحابہ نے اِس زور سے تکبیر کے نعرے بلند کیے کہ مکہ کی پہاڑیاں گونج اٹھیں۔ اسلام لاتے ہی حضرت عمر رضؓ نے کہا یا رسول اللہ اب ہم چھپ کر نماز نہیں پڑھ سکتے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے صحابہ کے ساتھ لے کر خانہ کعبہ میں آئے اور وہاں کھلم کھلا نماز باجماعت ادا کی گئی۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود نے کہا ہے: جب سے عمر نے اسلام قبول کیا ہم باعزت ہو گئے"، یہ واقعہ ۵ نبوی کا ہے۔

جب سنہ ۱۳ نبوی میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کا حکم ملا تو مسلمان آہستہ آہستہ چھپ چھپ کر مدینہ منورہ جانے لگے۔ مگر آپ نے اعلان کر دیا کہ "میں مدینہ جا رہا ہوں، جسے اپنی ماں کو اپنے اوپر رُلانا ہو وہ مجھے روک کر دیکھ لے"، چنانچہ کوئی آپ کے مقابلہ پر آنے کی ہمت نہ کر سکا۔ مدینہ منورہ میں، تمام اہم لڑائیوں میں آپ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پہلو بہ پہلو لڑے۔ اور کہیں آپ کے قدموں میں تزلزل پیدا نہ ہوا۔ آپ کے فہم و تدبّر کی وجہ سے حضور اہم معاملات میں آپ سے مشورہ بھی فرماتے تھے۔ اور اکثر ایسا ہوتا کہ بعد میں وحی آپ کے مشورہ کے مطابق اُترتی۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا: عمر میرے ساتھ ہے اور میں عمر کے ساتھ ہوں۔ اور میرے بعد ہر جگہ حق عمر کے ساتھ ہو گا"۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد، سقیفۂ بنی ساعدہ کے انتخابی جلسہ میں آپ نے جو شاندار کارنامہ انجام دیا اور مسلمانوں کو اس نازک موقعہ پر اختلاف کا شکار ہونے سے بچا لیا، اُس کی تفصیل گذر چکی ہے۔

آپ حضرت ابوبکر رضؓ کی خلافت کے زمانہ میں ان کے اہم مشیر و مددگار رہے۔ اسی لیے لشکرِ اُسامہ کے ساتھ جانے سے انھوں نے حضرت اسامہ سے اجازت لے کر آپ کو روک لیا تھا۔

آپ کے اِن ہی فضائل و کمالات کی وجہ سے دنیا سے رخصت ہوتے وقت حضرت صدّیقِ اکبرؓ نے مسلمانوں کی امامت کے لیے آپ ہی کو منتخب کیا اور تمام اکابرِ صحابہ نے آپ کے اس فیصلہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

واقعاتِ عہدِ خلافت

فتوحاتِ عراق

حضرت صدیقِ اکبرؓ نے اپنی خلافت کے آخری زمانہ میں، جب حضرت خالد بن ولید کو عراق سے شام بھیجا، تو عراق کے اکثر حصہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور نہرِ فرات کے جنوبی حصہ پر اسلام کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ حیرہ، جو ایران کے ماتحت عربی ریاست کا صدر مقام تھا اور جہاں نعمان بن منذر کا تاریخی محل خَوَرْنَق تھا، افواجِ اسلام کی چھاؤنی بن چکا تھا۔

حضرت خالدؓ کے بعد مُثنّیٰ بن حارثہ اسلامی عراقی لشکر کے سپہ سالار رہے، مگر فتوحات کا سلسلہ رک گیا۔ کچھ ہی مدت بعد خبریں ملیں کہ ایرانی پھر مسلمانوں کے مقابلہ کی زبردست تیاریاں کر رہے ہیں۔ مثنّیٰ نے دربارِ خلافت کو تازہ حالات سے آگاہ کرنے اور ایرانیوں سے نمٹنے کے لیے مزید فوجی مدد لینے کے لیے خود مدینہ منورہ جانا ضروری سمجھا۔ چنانچہ بشیر بن خَصَاصِیَہ کو اپنا قائم مقام بنا کر مدینہ منورہ روانہ ہو گئے۔ مثنّیٰ بن حارثہ جس روز مدینہ منورہ پہنچے ہیں، حضرت ابوبکر صدیق کی زندگی کا آخری دن تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق نے مرض کی شدت کے باوجود مثنّیٰ کو بُلا کر عراق کے حالات سُنے۔ پھر حضرت عمر فاروق سے کہا:

"اے عمر! میرا خیال ہے کہ میں آج کے بعد زندہ نہ رہ سکوں گا۔ اگر میں مر جاؤں تو تمہارا پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ مثنّیٰ کی مدد کے لیے تازہ دم فوج روانہ کرو۔ میری موت کی وجہ سے اس میں تاخیر نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے زیادہ ہمارے لیے کوئی مصیبت نہیں ہو سکتی تھی مگر تم نے دیکھا کہ میں نے اس موقعہ

پر بھی دشمنانِ اسلام کا قلع قمع کرنے میں ذرا دیر نہ کی۔ یہ دین کی بقا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کا معاملہ ہے۔"

اسی روز، حضرت صدیقِ اکبرؓ کا انتقال ہو گیا۔ ان کی تدفین سے فارغ ہوتے ہی، حضرت عمر فاروقؓ نے پہلا کام یہ کیا کہ سب مسلمانوں کو جمع کر کے عراق کے حالات سے آگاہ کیا۔ اور انھیں عراق کی مہم میں شرکت کی ترغیب دی۔ حضرت صدیقِ اکبرؓ کی بیماری، پھر وفات کی خبریں سُن کر مسلمان بڑی تعداد میں جمع تھے۔ مگر سلطنتِ فارس کی عظمت کچھ ایسی دلوں پر چھائی ہوئی تھی کہ سب خاموش رہے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ صرف خالد جیسی اللہ کی تلوار ہی ان کا قلع قمع کر سکتی ہے۔ مگر حضرت عمرؓ کا خیال یہ تھا کہ مسلمانوں کو کسی خاص شخصیت پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے وہ بار بار تقریریں کرتے اور مسلمانوں کو جوش دلاتے رہے۔

آخر حضرت عمرؓ نے ایک پُر زور تقریر کی اور کہا "وہ مسلمان کہاں ہیں جنھوں نے اسلام کے لیے اپنے عزیزوں، دوستوں اور گھر بار اور مال و دولت کو چھوڑا تھا؟ کیا انھیں یاد نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا کی حکومت کا وارث بنایا ہے۔ اور ان کے دینِ اسلام کو تمام دینوں پر غالب کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ ان کے وہ صالح بندے کیوں آگے بڑھ کر اللہ کے وعدوں کے پورا ہونے کا منظر نہیں دیکھتے؟"

حضرت مثنیٰؓ بن حارثہ نے بھی تقریر کی اور کہا "مسلمانو! ہم نے ایرانیوں کے قدم اُکھاڑ دیے ہیں اور عراق کی سرسبز زمینوں پر اپنے جھنڈے گاڑ دیے ہیں، ہمت سے کام لو اور دشمن کا نام و نشان مٹا دو!" ان تقریروں سے مجمع میں جوش پھیل گیا۔ سب سے پہلے قبیلۂ ثقیف کے سردار ابو عبید ثقفی کھڑے ہوئے اور اپنے آپ کو عراقی مہم کے لیے پیش کیا۔ پھر کئی دوسرے سردارانِ قبائل نے اپنے نام پیش کیے۔ چونکہ پہل ابو عبید کی طرف سے ہوئی تھی، اس لیے حضرت عمرؓ نے ان ہی کو امیرِ لشکر مقرر کیا۔ چونکہ وہ صحابی نہ تھے، اس لیے انھیں خاص طور پر صحابۂ کرام کے ادب و احترام کی نصیحت کی۔ پھر پہلے مثنیٰؓ بن حارثہ پھر جلد ہی ابو عبید ثقفی بھی مجاہدینِ اسلام کا

مشکر لیکر عراق کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس لشکر میں ارتداد سے توبہ کرنے والوں کو بھی شرکت کی اجازت دے دی گئی تھی۔

رُستم کی آمد

عراق پر اسلامی پرچم لہرانے سے ایرانیوں کے سینہ پر سانپ لوٹنے لگا تھا۔ انھوں نے صورتِ حالات کی نزاکت کو محسوس کیا اور اپنے اختلافات دور کرکے عربی خطرہ کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت تختِ ایران پر ملکہ آزرمی دخت متمکن تھی۔ اس نے اُمرائے سلطنت کو متحد کرکے ایک مشہور بہادر رستم کو جو فرخ زاد والیِ خراسان کا بیٹا تھا اور اپنی شجاعت اور مہارتِ جنگ میں ممتاز تھا، سپہ سالارِ اعظم مقرر کیا اور سب امرائے سلطنت سے اس کی وفاداری کا عہد لیا۔ رستم نے عراق کے مختلف علاقوں میں ہرکارے دوڑائے اور عراق کے زمینداروں اور رئیسوں کو مسلمانوں سے بغاوت پر اُکسایا، اور ان کو مذہبی غیرت اور قومی حمیّت کا جوش دلایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی ہی مدت میں ہر طرف بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ اور عراق کے اکثر مسلمانوں کے مقبوضہ علاقے ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔ پھر اس نے اپنے دو تجربہ کار افسروں نرسی اور جابان کو عراق کی طرف جانے کا حکم دیا۔

مثنیٰ بن حارثہ اور ابو عبید ثقفی حیرہ پہنچے تو ملک کا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ انھوں نے چند روز حیرہ میں قیام کیا اور حالات کا اندازہ کرکے آئندہ کے اقدام کا پروگرام بنایا۔

معرکۂ نمارق

جابان ایک زبردست فوج لے کر نمارق میں خیمہ زن ہو چکا تھا۔ ابو عبید لشکرِ اسلامی کو لے کر وہیں پہنچے، اور ایرانی لشکر کے مقابل صف آرا ہو گئے۔ دونوں لشکر ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ اور بڑی خوں ریز جنگ ہوئی۔ آخر ایرانیوں

کے پاؤں اُکھڑے اور انھوں نے راہِ فرار اختیار کی۔ مسلمانوں نے کئی ایرانی افسروں کو جن میں سپہ سالارِ لشکر، جابان بھی شامل تھا، گرفتار کرلیا۔

مگر جابان کو جس مسلمان نے گرفتار کیا تھا وہ اسے پہچانتا نہ تھا، اس نے دو غلاموں کے بدلہ اسے آزاد کرنے کا وعدہ کرلیا۔ بعد میں دوسرے مسلمانوں نے بتایا کہ یہ تو ایرانی سپہ سالار ہے، اسے چھوڑا نہیں جاسکتا۔ معاملہ اسلامی سپہ سالار تک پہنچا۔ ابو عبید نے کہا: اسلام میں عہد شکنی جائز نہیں۔ اور کسی ایک مسلمان کی بات سب مسلمانوں کی بات ہے۔

معرکۂ کُسکَر

نمارق کے شکست خوردہ ایرانی کسکر پہنچے، جہاں نرسی اپنی فوج لیے پڑا تھا اور نرسی کے لشکر میں شامل ہوگئے۔ نرسی آگے بڑھنے کے لیے مزید امدادی دستوں کا انتظار کررہا تھا جو مدائن سے روانہ ہوچکے تھے۔ ابو عبید ثقفی کو یہ معلوم ہوا تو وہ فوراً نمارق سے کسکر کی طرف روانہ ہوگئے۔ سَقاطِیَہ کے مقام پر دونوں فوجیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ ایرانی فوج کے بہادر بڑے جوش و خروش سے لڑے۔ مگر مجاہدینِ اسلام نے ان کو شکستِ فاش دی اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

ابو عبید نے ایرانیوں سے نمٹنے کے بعد، عراق کے اُن رئیسوں کو جو باغی ہوگئے تھے اطاعت کی ترغیب دی۔ انھوں نے دوبارہ پیمانِ وفاداری باندھا، اظہارِ خلوص کے لیے انھوں نے ایک دن پُرتکلف اور لذیذ کھانے ابو عبید کے پاس بھیجے۔ ابو عبید نے پوچھا "آپ نے یہ کھانے صرف میرے لیے بھیجے ہیں یا کل اسلامی فوج کے لیے انتظام کیا ہے؟" انھوں نے جواب دیا "جلدی میں کل فوج کے لیے انتظام نہ ہوسکتا تھا۔ یہ صرف آپ کے لیے ہے۔

ابو عبید نے کہا:

"ابو عبید سے بدتر کوئی نہیں اگر وہ الگ بیٹھ کر لذیذ غذائیں کھالے اور اُن ساتھیوں

کو چھوڑ دے جو خون بہانے میں اس کے شریک رہے ہیں۔ خدا کی قسم وہ وہی کھائے گا جو عام سپاہی کھائیں گے،،

چنانچہ تمام کھانے واپس کر دیے۔ دشمن کی فوج کو معلوم ہوا تو ان پر اسلام کی مساوات کا بڑا اثر ہوا۔

واقعۂ جسر

سپہ سالارِ ایران رستم کو ان شکستوں کی خبر ملی تو تلملا اٹھا۔ اس نے ایک بڑے ایرانی سردار بہمن جادویہ کو جو مذہبی پیشوا بھی تھا، عراق کی مہم کا افسر بنایا۔ اور بہت بڑی فوج دے کر اسے اس شان سے روانہ کیا کہ ایرانیوں کا قدیم مذہبی جھنڈا درفشِ کاویانی آگے آگے لہرا رہا تھا۔ یہ جھنڈا فتح کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ اسلامی سپہ سالار ابو عبید کو یہ خبر ملی تو وہ بھی اپنے آدمیوں کو لے کر مقابلہ کے لیے نکلے۔ دونوں لشکر مُرُوحَہ کے مقام پر، جو نہرِ فرات کے مغربی کنارے واقع تھا، ایک دوسرے کے مقابلہ پر صف آرا ہوئے۔ بہمن نے معلوم کیا کہ "ہم نہر کو پار کر کے تمہاری طرف آئیں یا تم ہماری طرف آتے ہو؟" ابو عبید کے ساتھیوں کی رائے تھی کہ دشمن کو اِدھر آنے دینا چاہیے۔ مگر ابو عبید نے اسے بُزدلی سمجھا اور کہلا بھیجا کہ "ہم ہی نہر پار کر کے تمہاری طرف آتے ہیں"، نہر پر کشتیوں کا پُل باندھا گیا اور اسلامی فوج دریا پار کر کے دشمن کے مقابلہ پر پہنچ گئی۔ دریا پار زمین ناہموار تھی، پھر ایرانی فوج کے آگے ہاتھیوں کی قطار تھی۔ عرب میں ہاتھی نہیں ہوتے۔ ہاتھیوں کی ہیبت ناک شکل دیکھ کر مسلمانوں کے گھوڑے بدکنے لگے۔ ابو عبید نے للکار کر کہا کہ مسلمانو! گھوڑوں سے اتر جاؤ اور ہاتھیوں کے ہودوں کی رسیاں کاٹ دو۔ رسیاں کاٹتے ہی ہودے اپنے سواروں سمیت زمین پر آ رہے مگر ہاتھی بدک اُٹھے۔ ابو عبید اور ان کے چند ساتھیوں نے ہاتھیوں کی سونڈیں کاٹ دیں۔ ایک ہاتھی نے ابو عبید کے سینہ پر پاؤں رکھ کر ان کو کچل دیا۔ ہڈیاں تک چور چور ہو گئیں۔ ان کے بہت سے

ساتھی بھی ہاتھیوں کے غصہ کا شکار ہوئے۔ ابو عبید کی شہادت سے مسلمانوں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ اور دریا کی طرف بھاگے۔ وہاں کسی مسلمان نے پُل توڑ دیا تھا تاکہ کوئی بھاگنے کا ارادہ نہ کرے۔ ہزاروں مسلمان دریا میں کود پڑے۔ مُثنّیٰ بن حارثہ نے اپنے دستہ کو لے کر دشمن کے نرغہ کو روکا، ادھر دوبارہ پُل بندھوا کر بہت سے سپاہیوں کو دریا پار کرایا۔ تاہم اس واقعہ میں تقریباً چار ہزار مسلمان کام آئے۔

مسلمان فوجی اِس شکست سے نہایت شرمندہ ہوئے۔ ان میں بہت سے منہ چھپا کر اِدھر اُدھر نکل گئے۔

اس معرکہ میں اسلامی فوج سے دو غلطیاں ہوئیں۔ پہلی تو یہ کہ وہ دریا پار کر کے ایسی جگہ پہنچے جہاں وہ اپنی صفیں صحیح طور پر نہیں آراستہ کر سکتے تھے۔ دوسری یہ کہ انھوں نے خود پُل توڑ دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں جو عالمِ اسباب ہے، اپنی بساط کے مطابق جِدّ و جہد اور صحیح تدبیر کرنا بھی ضروری ہے۔

معرکۂ بُویب

اِس کامیابی سے ایرانیوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ رستم نے مسلمانوں سے ایک فیصلہ کن ٹکر لینے کا ارادہ کیا۔ مَہران بن مہرویہ کو ایرانی فوج کا سپہ سالار بنایا کیوں کہ وہ عرب میں رہ چکا تھا اور عربوں کے طریقۂ جنگ سے خوب واقف تھا۔ پوران دخت (ملکۂ ایران) نے فوجِ خاصہ سے بارہ ہزار بہادر اس لشکر میں شامل ہونے کے لیے بھیجے۔ ایرانیوں کا یہ عظیم الشان لشکر دریائے فرات کے کنارے مقامِ بُویب پر خیمہ زن ہوا۔

اُدھر مدینہ منورہ میں خلافِ توقع معرکۂ جسرؔ کی ناکامی کی خبریں پہنچیں تو کہرام مچ گیا۔ حضرت عمرؓ کو سخت رنج ہوا اور آپ نے عرب کے مختلف حصوں سے مجاہدین جمع کر کے، مثنّیٰ بن حارثہ کی مدد کے لیے روانہ کیے۔ عربی نسل کے عیسائی

قبیلوں نمرؓ اور تغلبؓ نے بھی، قومی غیرت کے جذبہ سے عجم کے اس مقابلہ میں شرکت کی۔

دونوں لشکر مقامِ بویب میں نہرِ فرات کے دونوں کناروں پر آمنے سامنے جمع ہوئے۔

مہران نے یہاں بھی، مثنیٰؓ بن حارثہ کے پاس قاصد بھیج کر پوچھا کہ "تم ہماری طرف آتے ہو یا ہم تمہاری طرف آئیں"، مثنیٰؓ نے سابقہ تجربہ کی بنیاد پر جواب دیا کہ تم ہی آؤ۔

مثنیٰؓ نے خالدی طریقہ پر صف بندی کی تھی۔ مگر کچھ لوگ لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہی صف سے باہر نکلے پڑے تھے۔ مثنیٰؓ نے معلوم کیا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ بتایا گیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو پچھلے معرکہ میں ثابت قدم نہ رہ سکے تھے۔ مثنیٰؓ نے ان کو سمجھایا کہ جب تکبیر کہی جائے تو آگے بڑھیں۔ آخر لڑائی شروع ہوئی۔ دونوں طرف کے بہادر گتھم گتھا ہو گئے۔ مثنیٰؓ بہادری کے ساتھ تلوار چلاتے ہوئے دشمن کے قلبِ لشکر میں پہنچ گئے۔ ان کے بھائی مسعود زخم کھا کر گرے۔ مگر انھوں نے پروا نہ کی اور سیکڑوں کو لقمۂ اجل بنا دیا۔ سپہ سالارِ ایران مہران بھی بہادری کے ساتھ لڑتا رہا۔ آخر قبیلۂ تغلب کے ایک نوجوان نے مہران کو قتل کر دیا اور اس کے گھوڑے پر خود سوار ہو کر چیخا کہ "میں ہوں تغلب کا نوجوان مہران کا قاتل"۔

سپہ سالار کے مارے جانے پر ایرانیوں کے قدم اکھڑ گئے اور نہر پار کرنے کے ارادہ سے بھاگے۔ یہاں مثنیٰؓ نے پہلے ہی نہر کا پل توڑ وا دیا تھا۔ ہزاروں قتل ہوئے اور ہزاروں نہر میں ڈوبے۔

اس لڑائی میں ایک اندازہ کے مطابق ایک لاکھ ایرانی کام آئے۔ اس لڑائی سے عربوں کے دل سے ایرانیوں کا رعب جاتا رہا۔ اور مسلمان دجلہ اور فرات کے درمیانی علاقوں میں آزادانہ گھومنے پھرنے لگے۔

یزدگرد کی تخت نشینی

مدائن میں اس زبردست شکست کی خبر پہنچی تو تمام امرارِ سلطنت اور سردارانِ فوج جمع ہوئے۔ کافی بحث و غور کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ سب کچھ ملکہ پوران دخت کی کمزوری اور رستم اور فیروز کے، جو امیر الامرا تھے، آپس کے اختلافات کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ انھوں نے ان دونوں سے کہا، کہ یا تو تم اپنے اختلافات دور کر کے مل جل کر ملک کی حفاظت کے لیے میدان میں آجاؤ ورنہ ہم خود پہلے تمہیں ہی ٹھکانے لگا دیں گے۔ دونوں نے عہد کیا کہ وہ قوم کی حمایت اور ملک کی حفاظت کے لیے اتحاد و اتفاق کے ساتھ کام کریں گے اور دشمنوں کا مقابلہ کرنے میں کسر نہ چھوڑیں گے۔

پھر پوران دخت کو تخت سے اُتار کر، کسریٰ کے خاندان کی یادگار یزدگرد کو تخت نشین کیا گیا۔

مرکز کے اِس فیصلہ سے پورے مُلک میں جوش و خروش پھیل گیا اور عربوں کو اپنے ملک سے نکال باہر کرنے کے لیے زبردست تیاریاں شروع ہو گئیں۔ شکستہ قلعے درست کیے گئے۔ تازہ دم جوان فوج میں بھرتی کیے گئے۔ سرحدی علاقوں میں چھاؤنیاں قائم کی گئیں اور عراق کے علاقہ کے اُن رئیسوں کو، جو مسلمانوں کے زیرِ اثر آگئے تھے، ایرانی حکومت کی وفاداری پر آمادہ کیا گیا۔ چنانچہ بہت سے عراقی رئیس پھر ایرانیوں سے مل گئے اور بہت سے مفتوحہ علاقے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ مدینہ منورہ میں یہ خبریں پہنچیں تو حضرت عمرؓ نے مثنیٰؓ کو لکھا کہ تم اپنی فوجوں کو سرحدِ عرب کے محفوظ مقامات پر جمع کر لو۔ چنانچہ مثنیٰؓ سرحدِ عرب کے قریب مقامِ ذی قار پر اپنے لشکر کو لے کر چلے آئے، اور کچھ افسروں کو انھوں نے جُل، شرّاف اور عُضَیّل میں ان کی فوجوں کے ساتھ متعین کر دیا اور ان کو ہدایت کی کہ خطرہ کے وقت وہ ایک دوسرے کی مدد کریں۔ پھر حضرت عمرؓ نے عرب کے مختلف علاقوں میں اپنے ہرکارے بھیجے اور

حکم دیا کہ جہاں کہیں کوئی ماہر جنگ، بہادر سپاہی، مُدبّر یا مُقرّر ہو وہ مدینہ منورہ حاضر ہو کر لشکرِ اسلام میں شامل ہو۔ چنانچہ عرب کے ہر ہر حصہ سے مجاہدین کا ایک سیلاب اُمنڈ آیا۔ حضرت عمرؓ نے اس عظیم الشان لشکر کو جدید طریقہ پر میمنہ میسرہ، قلب اور مقدمۃ الجیش میں تقسیم کیا اور ان میں سے ہر حصہ پر ایک ایک ماہر جنگ کو افسر مُقرّر کیا۔ پھر انسانوں کے اس سیلاب کو لے کر آپ نے مدینہ سے تین میل دور مقامِ صِرار پر پڑاؤ ڈالا۔ مدینہ منورہ میں حضرت علی مرتضیٰؓ کو اپنا قائم مقام بنایا۔

سعد بن ابی وقاص کی سپہ سالاری

حضرت عمر فاروقؓ خود اس لشکر کے قائد بن کر میدانِ جنگ میں جانا چاہتے تھے مگر مسلمانوں میں اس معاملہ میں اختلاف تھا۔ حضرت عمرؓ نے اِس اہم معاملہ میں سب کی رائے لی۔ تمام مجاہدین تو اس بات سے خوش تھے کہ امیرالمومنین خود ان کے لشکر کی قیادت کریں، مگر اکابرِ صحابہ اس کے خلاف تھے۔ انھوں نے کہا امیرالمومنین لڑائی کے دونوں پہلو سامنے رکھنے چاہئیں۔ اگر خدانخواستہ کوئی بات خلافِ توقع ہوئی تو اس کا اثر بہت خراب ہوگا۔

حضرت فاروقؓ نے اکابرِ صحابہ کی رائے کے سامنے سر جھکا دیا۔ پھر اہل الرائے کے مشورہ کے مطابق حضرت سعد بن وقاص کو جو رسول اللہ کے ماموں اور عشرہ مبشرہ میں سے تھے، اپنی جگہ اس عظیم الشان اسلامی لشکر کا سپہ سالار مقرر فرما کر کوچ کا حکم دیا۔ پہلے حضرت علی سے درخواست کی گئی تھی، مگر انھوں نے معذرت کر دی۔ حضرت فاروقِ اعظم یوں تو مدینہ میں رہے، مگر حضرت سعد جہاں پہنچتے وہاں کا نقشہ بنا کر ان کو بھیجتے تھے۔ چونکہ حضرت فاروق اسلام سے پہلے عراق و شام کے کئی سفر کر چکے تھے اس لیے وہ ہر مقام کے حالات سے واقف تھے۔ وہ سعد کو تفصیلی ہدایات بھیجتے کہ فوج کو کہاں قیام کرنا چاہیے اور اگلی منزل کہاں ہونی چاہیے۔ اور دشمن

سے حفاظت کا کیا انتظام کرنا چاہیے؟ حقیقت یہ ہے کہ حضرت فاروقِ اعظم، اپنے تدبّر اور تجربہ کی روشنی میں مدینہ بیٹھ کر ہی لشکرِ اسلام کی سالاری کر رہے تھے۔

سعدؓ قادسیہ میں

حضرت سعد مدینہ سے کوچ کر کے زَرُوْد، سَیْرَاف، عُذَیْب میں منزلیں کرتے ہوئے قادسیہ پہنچے۔ یہ کوفہ کے جانے والے وقوع کے قریب ایک قصبہ تھا۔ اور حضرت عمرؓ کی ہدایت کے مطابق ایسی جگہ پڑاؤ ڈالا جس کے سامنے ایران کی زمین اور پیچھے عرب کے پہاڑ تھے۔

حضرت سعد کو راستہ ہی میں حضرت مثنیٰؓ بن حارثہ کے انتقال کی خبر ملی۔ ان کو جسر کی لڑائی میں زخم آئے تھے، وہ اچھے نہ ہوئے اور موت کا سبب بنے۔ انھوں نے اپنے انتقال سے پہلے اپنے تجربوں کی روشنی میں اسلامی لشکر کے سپہ سالار کے لیے وصیّت نامہ لکھ دیا تھا۔ ان کے بھائی مُعنّیٰ نے وہ وصیت نامہ سَیْراف میں حضرت سعد کو دے دیا تھا۔ اس میں ایرانیوں سے جنگ کے بارہ میں قیمتی مشورے تھے۔

اسلامی سفیر دربارِ ایران میں

قادسیہ میں حضرت سعد کو اطلاع ملی کہ رستم ایرانیوں کا بہت بڑا لشکر لے کر ساباط میں مقیم ہوا ہے۔ حضرت عمرؓ کو خبر دی گئی تو وہاں سے حکم آیا کہ اسلامی طریقہ کے مطابق، پہلے دربارِ ایران میں ایک سفارتی وفد بھیج کر حُجّت پوری کی جائے۔ چنانچہ چودہ لائق اور ذی علم اصحاب کو چُن کر مدائن بھیجا گیا، جو قادسیہ سے صرف تیس چالیس میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ یزدجرد شہنشاہِ ایران نے بڑی شان سے دربار سجایا اور جواہر نگار تخت پر بیٹھا اور سُفرائے اسلام کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ ارکانِ وفد، عربی جُبّے پہنے ہوئے، کاندھوں پر یمنی چادریں ڈالے ہوئے، ہاتھوں میں کوڑے لیے ہوئے، بے باکانہ دربار میں داخل ہوئے،

ان کی ہیبت ناک صورتیں اور ان کا بے باکانہ انداز دیکھ کر سارے دربار پر رُعب چھا گیا۔

شہنشاہ کو ان کی اس بے ادبی اور گستاخی پر غصہ آیا مگر سفیروں کو سزا نہ دی جا سکتی تھی، اس لیے خاموش ہو رہا۔ پھر ترجمان کی معرفت گفتگو شروع ہوئی۔

بدفالی

شہنشاہ نے ان کی چادروں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ عربی میں ان کو کیا کہتے ہیں؟ جواب دیا گیا "بُرُد"۔ ایرانی فال لینے کے بہت عادی تھے۔ فارسی میں "برد" کے معنی ہیں "لے گیا"، بادشاہ نے کہا افسوس! یہ ہمارا مُلک لے گئے۔ پھر ان کے کوڑوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ عربی میں ان کو کیا کہتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا "سَوْط"، وہ سوخت سمجھا۔ کہنے لگا "افسوس انھوں نے ہمارا ملک پھونک بھی ڈالا۔

سُفرا کا نعرۂ حق

پھر ان ارکانِ وفد کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا: تم لوگ یہاں میرے ملک میں کیوں آئے ہو، تم قدیم زمانہ سے ہمارے ماتحت رہے ہو اور ہم تمہارے نگہ باں رہے ہیں اور تمہاری ضرورتوں کو پورا کرتے رہے ہیں۔ کیا تم کو اب ہم سے کوئی شکایت پیدا ہو گئی ہے؟

اس کے جواب میں حضرت نعمان بن مُقرِن نے جو امیرِ وفد تھے ایک مختصر مگر ولولہ انگیز تقریر کی جس کا خلاصہ یہ ہے:

"اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہم پر رحم فرمایا اور اپنے مُقدّس پیغمبر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر ہم کو عزت بخشی۔ پھر حضورؐ کی صفات اور آپ کی تعلیمات کا ذکر کیا، پھر کہا کہ آپ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ان اعلیٰ

تعلیمات کو دنیا کے سامنے پیش کریں۔ اب تین راستے ہیں۔ یا تو تم لوگ ان تعلیمات کو قبول کر کے ہمارے ساتھی بن جاؤ۔ اور اگر یہ منظور نہیں تو جزیہ ادا کرنا قبول کر کے ہمارے نظام میں داخل ہو جاؤ ورنہ پھر جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

کسریٰ یہ سنکر بھڑک اٹھا اور کہا:

"اے اہلِ عرب! جہاں تک میں جانتا ہوں، دنیا میں کوئی قوم تم سے زیادہ بدبخت، تم سے زیادہ حقیر اور تم سے زیادہ بدحال نہ تھی۔ جب تم کوئی حرکت کرتے تھے تو ہم اپنے ماتحت زمینداروں کو اشارہ کر دیا کرتے تھے اور وہ تمہیں درست کر دیتے تھے۔ تم اہلِ فارس کے مقابلہ کا خیال دل سے نکال دو اگر تم تنگ حال ہو تو ہم تمہارے کھانے پہننے کا انتظام کر دیں گے۔ اور ایسے شخص کو تمہارا حاکم بنا دیں گے جو تمہارے ساتھ نرم برتاؤ کرے گا۔"

ارکانِ وفد میں سے مُغیرہؓ بن زُرارہ کسریٰ کی اس بدکلامی کو برداشت نہ کر سکے، اور کھڑے ہو کر کہا:

"اے بادشاہ، تو نے عربوں کی جس بدحالی کا ذکر کیا ہے، بے شک کبھی وہ ایسے ہی تھے بلکہ اس سے بدتر، مگر اب صورتِ حالات بدل چکی ہے۔ اللہ نے ان پر رحم فرمایا اور اپنے مقدس رسول کو اُن کی طرف بھیجا۔ اس نے ان میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ اس کی تفصیل نعمان بیان کر چکے۔ اب اِس کے سوا چارہ نہیں کہ یا تو تم بھی اس کی تعلیمات کو قبول کر کے ہمارے بھائی بن جاؤ۔ ورنہ جزیہ یا تلوار میں سے کسی ایک کو منظور کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

یہ جواب سُن کر کسریٰ نے کہا: اگر قاصدوں کو قتل کرنے کا دستور ہوتا تو میں تم سب کو ٹھکانے لگا دیتا۔ پھر اس نے ایک ٹوکرا مٹی منگائی اور امیرِ وفد کے سر پر رکھدی۔

اور کہا اسے لے جاؤ اور اپنے سردار سے کہدو کہ میں تمہاری طرف رستم کو بھیج رہا ہوں۔ وہ تم سب کو قادسیہ کی خندق میں دفن کردے گا۔ پھر تمہارے شہروں کو تباہ و برباد کردے گا۔ وفد کے لوگ خوش خوش حضرت سعد کے پاس واپس آئے اور ان سے کہا "مبارک ہو دشمن نے خود اپنی زمین ہمیں دے دی ہے"۔

رستم قادسیہ میں

اس کے بعد اکسریٰ نے رستم کو حکم دیا کہ ساباط سے نکل کر قادسیہ پہنچے اور اسلامی فوج پر حملہ آور ہو۔ رستم کافی مدت تک ٹال مٹول کرتا رہا مگر جب بادشاہ نے ڈانٹ پلائی تو اس شان سے نکلا کہ اس کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار فوج تھی اور کوہ پیکر ہاتھیوں کا ایک غول۔ ایران کے دو مشہور پہلوان ہرمزان اور مہران میمنہ اور میسرہ پر تھے۔

مگر ایرانی فوج کے سپاہی راستہ میں بدمستیاں کرتے جارہے تھے، جہاں سے گذرتے لوگوں کا مال لوٹ لیتے اور ان کی عورتوں کو بے آبرو کرتے۔ رستم کو بہت افسوس ہوا اور اس نے کہا: اب ہماری قوم اللہ کے عذاب سے نہیں بچ سکتی۔ جو قوم کمزوروں پر ظلم کرے اور اپنے ماتحتوں کی عزت و آبرو سے کھیلے وہ حکومت نہیں کرسکتی"۔ آخر رستم نے قادسیہ پہنچ کر، مقام عتیق میں ڈیرے ڈالے۔ رستم لڑنے سے جی چرا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح لڑائی ٹل جائے اس لیے اس نے اسلامی لشکر میں پیغام بھیجا کہ کسی قاصد کو بھیجا جائے تاکہ لڑائی کے بجائے گفتگو کے ذریعہ معاملہ طے کرلیا جائے۔

حضرت سعد نے ربعی بن عامر کو سفیر بنا کر بھیجا۔

ربعی رستم کے دربار میں

رستم نے سفیرِ اسلام کو مرعوب کرنے کے لیے بڑی شان و شوکت کا

مظاہرہ کیا۔ ایک بہت بڑا خیمہ نصب کیا گیا، جس کے جھالروں میں موتی ٹنکے ہوئے تھے۔ زرنگار رومی قالینوں کا فرش بچھوایا گیا۔ درمیان میں سونے کا بنا ہوا شاندار تخت بچھوا کر اس پر رستم بیٹھا۔ چاروں طرف ہاتھی ریشمی جھولوں سے آراستہ پرا جائے کھڑے تھے۔ ربعی بن عامر پہنچے اور ان کو دربار میں طلب کیا گیا ان کے بدن پر معمولی پھٹے پرانے کپڑے تھے۔ ایک رسّی سے کمر باندھ رکھی تھی، اور اس میں تلوار لٹکا رکھی تھی جو نیام کی جگہ چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں ایک بڑا نیزہ تھا، وہ اپنا گھوڑا دوڑاتے ہوئے خیمہ میں گھس گئے۔ پھر دربار کے گاؤتکیوں سے اپنے گھوڑے کو باندھ کر، اپنے نیزہ سے سہارا لیتے ہوئے اور قیمتی قالینوں کو نیزہ کی اَنی سے چھیدتے ہوئے، رستم کے برابر تخت پر جا بیٹھے، پہرے کے سپاہیوں نے ربعی کو نیچے اتارنا چاہا مگر انھوں نے گرج کر کہا: "میں بلایا ہوا آیا ہوں۔ اگر تم نے مجھ پر پابندی عائد کی تو میں واپس چلا جاؤں گا" سپاہی پیچھے ہٹ گئے۔

اب رستم ان کی طرف مخاطب ہوا اور پوچھا کہ آپ لوگ ہمارے ملک میں کیوں آئے ہیں؟

ربعی نے جواب دیا، ہمیں خدا نے حکم دیا ہے کہ ہم سب دنیا والوں کو غلامی کے تنگ غار سے آزادی کی وسعتوں کی طرف لائیں۔ مذاہبِ باطلہ کے ظلم و جَور سے، اسلام کے عدل و انصاف کی طرف ان کی رہنمائی کریں۔ دینِ حق کو تمام قوموں پر پیش کریں، جو اسے قبول کریں ہم ان کو گلے لگالیں، وہ آزاد ہیں، اور جو انکار کریں ہم ان سے جنگ کریں۔ پھر یا ہم کامیاب ہو کر حکومتِ الٰہی قائم کریں یا خدا کے راستہ میں جان دے کر جنت میں اپنا گھر بنائیں۔

رستم ربعی کی گفتگو سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے ربعی سے کہا "اچھا ہمیں ابھی سوچنے اور مشورہ کرنے کے لیے کچھ مُہلت دو" ربعی نے جواب دیا، ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن کی مہلت کا حکم دیا ہے۔ چوتھے دن مقابلہ ہے۔

اس کے بعد رستم نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔ آخری مرتبہ حضرت مغیرہ گئے۔ رستم کا دربار پھر بڑی شان و شوکت سے سجایا گیا۔ دیبا و سنجاب کے فرش بچھائے گئے۔ فوج کے افسر اور اہلِ دربار اپنے اپنے درجہ کے مطابق پرے جما کر کھڑے ہوئے۔ رستم صدر مقام پر تخت پر بیٹھا۔ حضرت مغیرہ گھوڑے سے اُتر کر رستم کے زانو سے زانو ملا کر بیٹھ گئے۔ چوبداروں نے ان کا باز و پکڑ کر ان کو تخت سے اتار دیا۔ حضرت مغیرہ نے برہم ہو کر کہا: "اے اہلِ دربار! میں بلایا ہوا آیا ہوں۔ مہمان کے ساتھ تم کو یہ سلوک مناسب نہ تھا، ہم مسلمان آپس میں سب برابر ہوتے ہیں۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ تم میں سے بعض، بعض کے خدا ہیں، تو میں تمہارے یہاں نہ آتا۔ یہ کیا طریقہ ہے کہ تم میں سے ایک خدا بنا بیٹھا ہے۔ اور دوسرے بندے بن کر اس کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں"۔ مغیرہ کی زبان سے یہ تقریر سُن کر عام درباریوں نے کہا "اس عربی نے بات تو سچ کہی"، امرا نے کہا: "یہ تو ہمارے غلاموں کو ورغلا رہا ہے"، رستم نے کہا: آفتاب کی قسم میں کل ان کے دماغ درست کر دوں گا۔ ہم نے اب تک ان کے ساتھ نرمی کر کے بڑی غلطی کی ہے"۔ غرض یہ سفارت بھی ناکام رہی۔

جب ایرانی لشکر میں بد دلی پھیلنے لگی اور مزید دیر کرنے میں کوئی فائدہ بھی نظر نہ آیا، تو رستم نے صف آرائی کا حکم دیا۔

اسلامی لشکر اور ایرانی لشکر کے درمیان ایک نہر پڑتی تھی۔ ایرانی لشکر نہر پار کر کے اسلامی لشکر کے مقابلہ میں صف آرا ہو گیا۔

ایرانی فوج کو میمنہ، میسرہ اور قلب پر تقسیم کیا گیا۔ اس کی حفاظت کے لیے ہاتھیوں کے پرے جمائے گئے۔ رستم خود دوہری زِرہیں پہنے ہوئے، سر پر خود رکھے قلبِ لشکر میں موجود تھا۔

ادھر لشکرِ اسلام کے سپہ سالار حضرت سعد بن وقاص کو عرق النسا کی بیماری تھی پھر قادسیہ پہنچ کر ان کے بدن پر پھنسیاں بھی نکل آئی تھیں۔ وہ گھوڑے پر

سوار نہ ہو سکتے تھے۔ میدانِ قادسیہ ملا ہوا ایک قدیم محل تھا۔ وہ اس کی چھت پر بیٹھے ہوئے فوج کی رہنمائی کر رہے تھے۔ اور اپنے نائب خالد بن عُرفطہ کو اوپر سے پرچے پھینک پھینک کر ہدایات دے رہے تھے۔

جنگِ قادسیہ

یومِ اِرماث

جنگ شروع ہونے سے پہلے، خطیبِ اسلام نے جہاد کے فضائل پر پُرزور تقریریں کیں۔ شعرا نے پرجوش نظمیں پڑھیں اور خوش آواز قاریوں نے سورۂ انفال کی تلاوت کی۔ پھر حضرت سعد نے تین تکبیریں کہیں۔ تیسری تکبیر پر حسبِ قاعدہ مجاہدینِ اسلام نے تلوار سے بجلیاں برسانی شروع کر دیں، ایرانی بہادر بھی اپنی تلواروں کے جوہر دکھانے لگے۔

اس زمانہ کے قاعدہ کے مطابق، سب سے پہلے ایرانی فوج میں سے ایک مشہور بہادر ہُرمُز نکلا۔ یہ شاہی خاندان سے تھا اور سر پر تاج پہنے ہوئے تھا۔ اس کے مقابلہ کے لیے غالب بن عبداللہ اسدی نکلے۔ تھوڑی دیر دونوں طرف سے دو دو ہاتھ ہوئے۔ آخر غالب نے اس کے ہاتھ سے تلوار چھین لی، اور اسے زندہ گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد دو اور بہادر میدان میں آئے، اور مجاہدینِ اسلام کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔

اس کے بعد رستم نے ہاتھی سواروں کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ قبیلۂ بُجیلہ کے بہادروں نے اس حملہ کو روکا۔ مگر ہاتھی عرب میں نہیں ہوتے۔ ہاتھیوں کو دیکھ کر بنی بجیلہ کے گھوڑے بھڑک اٹھے۔ اس ریلے میں بنی بجیلہ کے بہت سے سوار نیچے گرے، اور ہاتھیوں کے قدموں تلے روندے گئے۔

حضرت سعدؓ نے فوراً بنی اسد کے سواروں کو بجیلہ کی مدد کا حکم دیا، بنی اسد کا سردار طُلَیحہ بن خُوَیلِد اپنے ساتھیوں کو لے کر نکلا اور ہاتھیوں کو تیروں کی باڑ پر رکھ لیا۔ ہاتھی تلملا کر پیچھے بھاگے اور خود ایرانیوں ہی کی صفیں درہم و برہم کر دیں۔

رات کا اندھیرا چھایا تو لڑائی روک دی گئی۔ اس دن اگرچہ ہزاروں ایرانی بھی کام آئے مگر ہاتھیوں کی وجہ سے مسلمانوں کا بھی خاصہ جانی نقصان ہوا، اس دن کو "یوم الاِرماث" کہا جاتا ہے۔

یومِ اِغواث

دوسرے دن پہلے شُہدا کو دفن کیا گیا اور زخمیوں کو خواتین کے خیموں میں پہنچایا گیا جو زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کے لیے ساتھ آئی تھیں۔ پھر میدانِ جنگ گرم ہوا۔ ابھی لڑائی شروع ہی ہوئی تھی کہ شام کی طرف سے گرد و غبار اڑتا نظر آیا۔ تھوڑی ہی دیر میں شام کی امدادی فوج، جو حضرت عمرؓ کے حکم سے حضرت ابو عبیدہ نے بھیجی تھی، پہنچ گئی۔ یہ چھ ہزار مختلف قبیلوں کے مجاہدین کی فوج بہت سے دستوں میں تقسیم تھی۔ یہ دستے یکے بعد دیگرے اس تدبیر سے آرہے تھے کہ جب ایک آچکتا تو دوسرا نمودار ہوتا۔ مسلمانوں کی ہمتیں اس سے بہت بڑھ گئیں اور ایرانیوں پر رُعب چھا گیا۔

قعقاع، جو اگلے دستہ کے امیر تھے، اپنے ساتھ بہت سے اونٹ لائے تھے انھوں نے اونٹوں پر سیاہ جھولیں ڈال کر ہاتھیوں کا جواب پیدا کر لیا۔ یہ مصنوعی ہاتھی جدھر نکل جاتے ایرانیوں کے گھوڑے بدکنے لگتے اور ان کی صفیں درہم و برہم ہو جاتیں۔ پھر بھی ایرانی بڑے جوش و خروش سے لڑے اور دونوں طرف کے بہادروں نے اپنی بہادری کے جوہر دکھائے۔ آدھی رات تک گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی مگر پھر بھی لڑائی کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ آج مسلمانوں کا پلڑا بھاری رہا۔ مسلمان دو ہزار شہید اور زخمی ہوئے۔ اور ایرانی دس ہزار کام آئے۔

یہ دن یوم الاغواث کہلاتا ہے۔

ابو محجن کی بے قراری

اس روز ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ابو محجن ثقفی ایک مشہور بہادر تھے۔ مگر انھیں شراب کی لت تھی۔ حضرت سعد نے اسی شکایت کی بنا پر انھیں اپنے محل کے بالاخانہ پر ایک کمرہ میں قید کر رکھا تھا۔ وہ اپنے کمرہ کی ایک کھڑکی سے میدانِ جنگ کا منظر دیکھ رہے تھے اور لڑائی میں شریک نہ ہونے پر تلملا رہے تھے۔ حضرت سعد کی بیوی سلمیٰ تھوڑی دیر کے لیے ادھر سے گذریں تو عاجزی اور اصرار کے ساتھ کہا: بہن مجھے خدا کے واسطے تھوڑی دیر کے لیے رہا کر دو۔ میں دشمن سے دو دو ہاتھ کر آؤں اور اپنے دل کی حسرت نکال آؤں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر زندہ بچا تو واپس آکر خود بیڑیاں پہن لوں گا۔" سلمیٰ نے پہلے تو انکار کیا مگر جب بہت خوشامد کی تو ان کی بیڑیاں کاٹ دیں۔ ابو محجن بجلی کی طرح تڑپ کر دشمن کی فوج میں گھس گئے اور بیسیوں کو خاک و خون میں تڑپا دیا۔ مسلمان بھی حیران تھے کہ یہ کون اللہ کا شیر ہے اور کدھر سے نکل آیا ہے۔ شام کو اپنی حسرت نکال کر اپنی جگہ واپس آئے اور خود بیڑیاں پہن لیں۔

رات کو سلمیٰ نے حضرت سعد کو تمام قصہ سنایا۔ انھوں نے کہا: میں بھی سوچ رہا تھا کہ یہ بہادر کون ہے، اندازہ تو ابو محجن کا سا ہے۔ پھر ابو محجن کو قید خانہ سے بلا کر کہا: خدا کی قسم جو شخص اسلام پر اس طرح اپنی جان قربان کرے، میں اسے قید میں نہیں رکھ سکتا۔ اور ان کو اسی وقت رہا کر دیا۔ ابو محجن نے کہا: تو میں بھی آج سے شراب کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔

یومِ عماس

لڑائی کے تیسرے دن بھی پہلے شہیدوں کی تدفین کی گئی اور زخمیوں کو مرہموں

کے کیمپ میں پہنچایا گیا۔ پھر لڑائی شروع ہوئی۔ میدانِ جنگ سے مدائن تک ڈاک کا سلسلہ قائم تھا۔ شہنشاہِ ایران کو مسلسل خبریں پہنچ رہی تھیں۔ یزدگرد نے ہاتھیوں کی اور کھیپ بھیج دی تھی۔ صبح ہوتے ہی لڑائی شروع ہوئی تو ہاتھیوں کی یہی کالی بلا سامنے آئی۔ حضرت سعدؓ نے دو نومسلم ایرانیوں کے مشورہ سے حکم دیا کہ ہاتھیوں کی سونڈیں کاٹ دی جائیں اور ان کی آنکھیں بیکار کر دی جائیں۔ چنانچہ پہلے دو بڑے ہاتھیوں پر، جو سب سے آگے تھے، یہی عمل کیا گیا۔ وہ تلملا کر پیچھے بھاگے تو دوسرے ہاتھی بھی ان کے پیچھے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور ایرانیوں کی صفیں کی صفیں کچل دیں۔ مگر ایرانیوں نے جلد ہی اپنی صفوں کو درست کر لیا اور دونوں طرف کے بہادر تمام دن دادِ شجاعت دیتے رہے۔ لڑائی کا فیصلہ نہ ہوا تو لڑائی رات کے وقت بھی جاری رہی۔ میدانِ جنگ میں ہر طرف گھوڑوں کی ٹاپوں کی گھڑ گھڑاہٹ اور جنگی نعروں کی گونج سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اور تلواروں اور نیزوں کی چمک سے آنکھیں چُندھیا رہی تھیں۔ ایسی بھیانک لڑائی کا منظر نہ پہلے عربوں نے دیکھا تھا نہ عجمیوں نے۔

صبح ہوتے ہی اسلامی فوج کے چند بہادروں نے فیصلہ کیا کہ رستم پر حملہ کیا جائے۔ چنانچہ گھوڑوں سے کود کر، تلواریں سونت کر دشمن کی فوج کے درمیان میں پہنچ گئے، جہاں رستم اپنے لشکر کی رہنمائی کر رہا تھا۔ رستم اور اس کے چند محافظ سپاہی بڑی بہادری سے لڑ رہے تھے مگر جب رستم زخموں سے چور چور ہو گیا تو پیچھے کی طرف بھاگا۔ ایک مسلمان سپاہی ہلال نے اس کا پیچھا کیا۔ سامنے نہر تھی، رستم نے اس میں کود کر پار اترنے کی کوشش کی مگر ہلال بھی نہر میں کود پڑے اور ٹانگیں پکڑ کر اسے باہر نکال لائے اور قتل کر دیا۔

ہلال نے رستم کے تخت پر چڑھ کر بلند آواز سے اعلان کیا کہ لوگو، میں نے رستم کو قتل کر دیا ہے۔ اپنے سپہ سالار کے قتل کے بعد ایرانی فوج میں بھگدڑ

پڑ گئی۔ مسلمانوں نے پیچھا کیا۔ ہزاروں ایرانی قتل ہوئے اور ہزاروں نہر میں غرق ہو گئے۔ ایرانیوں کا تاریخی مذہبی جھنڈا درفشِ کاویانی بھی مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔ اس معرکہ میں اندازاً تیس ہزار ایرانی کام آئے اور مسلمان بھی آٹھ ہزار شہید ہوئے۔ حضرت سعد نے دوگانہ شکر ادا کیا اور امیرالمومنین فاروقِ اعظم کو خوشخبری بھیجی اور مبارکباد کا خط لکھا۔ لڑائی کا یہ آخری معرکہ یوم العماس کہلاتا ہے۔

خلیفہ بھی اسلام کا سپاہی ہے

حضرت فاروقِ اعظم رضؓ کو قادسیہ کی لڑائی کا بڑا فکر رہتا تھا، طلوعِ آفتاب سے، نصف النہار تک ہر روز وہ مدینہ سے باہر نکل کر حضرت سعد کے قاصد کا انتظار کرتے تھے۔ جب گرمی تیز ہو جاتی تو واپس ہوتے تھے۔

جس روز سعد کا قاصد مدینہ پہنچا وہ حسبِ معمول اس کے انتظار میں صحرا میں تھے۔ قاصد اُن کو پہچانتا نہ تھا۔ وہ ان کو دیکھ کر نہ رُکا اور مدینہ کا رُخ کیا۔ حضرت عمر رضؓ نے اس کے پیچھے دوڑنا شروع کیا۔ اور دوڑتے ہوئے قاصد سے فتح کی روئداد سنتے رہے۔ جب آبادی میں پہنچے تو ہر شخص نے ان کو امیرالمومنین کہہ کر سلام کرنا شروع کیا۔ اب قاصد سمجھا کہ جس شخص سے وہ گفتگو کر رہا ہے وہ خود حضرت فاروقِ اعظم ہیں۔ اس پر وہ کانپ اٹھا مگر حضرت عمر نے اسے تسلی دی اور کہا، میں بھی اسلام کا ایک سپاہی ہی ہوں۔ پھر جب مسجدِ نبوی میں پہنچے تو حضرت سعد کا خط لے کر پڑھا۔ مسلمانوں کو فتح کی خوشخبری سنائی اور بارگاہِ خداوندی میں سجدۂ شکر ادا کیا۔ یہ واقعہ ۱۵ھ کا ہے۔

فتح بابل

فتح کے بعد حضرت سعد نے دو مہینہ قادسیہ میں قیام کیا۔ مقصد یہ تھا کہ لشکرِ اسلام تازہ دم ہو جائے اور مدینہ منورہ

سے اگلے اِقدام کے لیے اَحکام آجائیں۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ ایران کے دارالسلطنت مدائن پر حملہ کیا جائے۔ مدائن قادسیہ سے تقریباً ۴۰ میل تھا۔

آخر، اسلامی فوج، بیشتر اُن گھوڑوں پر سوار ہو کر، جو اسے ایرانیوں سے ہاتھ لگے تھے، قادسیہ سے نکلی۔ مقام بُرَلُس میں شکست خوردہ ایرانی سردار جن میں ہُرمُزان بھی تھا، اپنی فوجیں لیے پڑے تھے۔ مسلمانوں کے پہنچتے ہی یہ سردار بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہاں معلوم ہوا کہ ایرانیوں نے بابُل کے مقام پر اپنی فوجیں جمع کی ہیں اور بڑے بڑے ایرانی افسر یہاں مورچہ قائم کیے ہوئے ہیں۔ حضرت سعد فتح کا پرچم اڑاتے یہاں پہنچے تو پہلے ہی حملہ میں ایرانی سرداروں نے راہِ فرار اختیار کی۔ ہرمزان نے اَہواز کا راستہ لیا۔ فرُّخان نے نہاوند کا رُخ کیا، دوسرے سردار مدائن چلے گئے۔ انھوں نے خود پار اتر کر دِجلہ کا کشتیوں کا پُل توڑ دیا تاکہ مسلمان دریا پار نہ کر سکیں۔

فتح بہرہ شیر حضرت سعد بابل میں چند روز ٹھہرے، پھر زُہرہ کو کچھ فوج دے کر آگے بھیجا۔ زہرہ، بہرہ شیر کے قریب جا کر مقیم ہوئے۔ بہرہ شیر دریائے دجلہ کے مغربی کنارہ پر ایک فوجی چھاؤنی تھی۔ مشرقی کنارہ پر دارالسلطنت مدائن تھا۔ یہاں قلعہ میں کچھ شیروں کو بھی رکھا گیا تھا۔ اسلامی فوج وہاں پہنچی تو ایک شیر ببر اس کی طرف بڑھا۔ ایک مسلمان افسر ہاشم نے تلوار کے پہلے ہی وار میں اسے ڈھیر کر دیا۔ ایرانی فوج اس بہادری سے حیران رہ گئی۔ حضرت سعد دو ماہ تک بہرہ شیر کا محاصرہ کیے رہے۔ ایک روز محصور ایرانی فوج بڑے جوش کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے نکلی۔ اسلامی فوج بھی فوراً میدان میں آئی۔ ایرانی بہادر، مجاہدینِ اسلام کے مقابلہ میں ٹھہر نہ سکے۔ آخر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور مدائن میں پہنچ کر دم لیا۔ مسلمانوں نے شہر میں داخل ہو کر قلعہ پر قبضہ کر لیا۔

یہاں آس پاس کے بہت سے رئیس اور چودھری حضرت سعد کے پاس آئے

اور جزیہ کی ادائگی کے وعدہ پر مسلمانوں کی ماتحتی قبول کی۔

مدائن کی فتح

بہرہ شیر پر قبضہ کے بعد، ایرانی دارالسلطنت مدائن آنکھوں کے سامنے تھا۔ اور کسریٰ کے مشہور قصر، قصرِ ابیض، کے بُرج سورج کی روشنی میں چمکتے نظر آرہے تھے۔

مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یاد آیا کہ:

لَتَفْتَحَنَّ عِصَابَةٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ كَنْزَ اٰلِ كِسْرٰى الَّذِيْ فِي الْاَبْيَضِ (صحیح المسلم)

مسلمانوں کی ایک جماعت خاندانِ کسریٰ کے خزانہ کو فتح کرے گی جو قصرِ ابیض میں ہوگا۔

وہ اس محل میں داخل ہونے کے لیے بے چین ہوگئے۔ ادھر معلوم ہوا کہ کسریٰ نے خاندانِ شاہی کو پہلے ہی حلوان روانہ کردیا ہے، اب وہ شاہی خزانے اور محل کا قیمتی ساز و سامان منتقل کر رہا ہے۔ مگر دریائے دجلہ پوری تیزی سے بہ رہا تھا۔ پُل پہلے ہی ایرانیوں نے توڑ دیا تھا اور کشتیاں دوسرے کنارہ پر لگادی تھیں۔

حضرت سعد نے سب سے پہلے، دریا میں اپنا گھوڑا ڈالا، ان کے ساتھ حضرت سلمان فارسی تھے۔ ان کے بعد اسلامی لشکر نے بے تامل اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیے۔ وہ رکاب سے رکاب ملائے ہوئے، دریا کی موجوں سے ٹکراتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ اور ان کی زبان پر یہ دعا تھی:

نستعين بالله ونتوكل عليه حسبنا الله ونعم الوكيل ولاحول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم.

ہم اللہ سے مدد مانگتے ہیں اور اس پر بھروسہ کرتے ہیں اور وہ بہتر کارساز ہے۔ ہر قسم کی طاقت و قوت اللہ ہی سے ہے جو برتر اور عظمت والا ہے۔

تھوڑی دیر میں مسلمان دریا کے دوسرے کنارے پر تھے۔ ایرانیوں نے جب مجاہدینِ اسلام کو خشک زمین کی طرح دریا کی لہروں پر چلتے دیکھا تو وہ دہشت زدہ

رہ گئے اور چیخنے لگے "دیواں آمدند دیواں آمدند" (دیو آ گئے دیو آ گئے) پھر بھی تیر اندازوں کی ایک جماعت نے آگے بڑھ کر اسلامی فوج کو روکنے کی کوشش کی مگر منہ کی کھائی اور بھاگ کھڑے ہوئے۔

اسلامی فوج دریا کے اس پار اتری تو شہنشاہِ ایران اپنے افسروں کو ساتھ لے کر شہر سے باہر نکل گیا اور حلوان کا راستہ لیا۔ حضرت سعدؓ، شہنشاہِ ایران کے تاریخی محل قصرِ ابیض میں داخل ہوئے تو ان کی زبان پر بے اختیار یہ آیتیں جاری ہو گئیں:

كَمْ تَرَكُوا مِنْ جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ وَزُرُوعٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ وَنَعْمَةٍ كَانُوا فِيهَا فَاكِهِينَ كَذَٰلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ (دخان ۲۵-۲۸)

اور کتنے ہی انھوں نے باغات چھوڑے اور چشمے اور کتنی ہی کھیتیاں اور کتنے ہی عمدہ مکانات اور نعمت کے سامان جن میں وہ مزے اڑاتے تھے۔ یہی ہوا اور ہم نے دوسری قوم کو ان کا وارث بنایا۔

یہ واقعہ صفر ۱۶ھ کا ہے۔ جمعہ کا دن تھا۔ قصرِ ابیض میں تختِ شاہی کے قریب منبر رکھا گیا اور جمعہ کی پہلی باجماعت نماز وہیں ادا کی گئی۔ اردگرد بہادرانِ فارس کے چونے پتھر کے بنے ہوئے مجسمے تھے۔ حضرت سعد نے ان کو نہیں توڑا۔ پھر شاہانِ ایران کے صدیوں کے جمع کیے ہوئے خزانے، جواہر نگار شاہی تاج، پرانے بہادروں کی مرصع تلواریں اور خنجر، موتیوں سے آراستہ ریشمی ملبوسات، سونے چاندی کے انسانوں اور جانوروں کے مجسمے اور زر نگار قیمتی قالین اور فرش جمع کیے گئے۔

حضرت سعدؓ نے تاریخی نادر چیزیں دربارِ خلافت میں روانہ کیں۔ ان میں دربارِ شاہی کا ایک عجیب و غریب فرش تھا۔ اس کو "بہار" کا نام دیا گیا تھا۔ یہ ساٹھ گز لمبا اور اتنا ہی چوڑا تھا۔ اس میں رنگا رنگ جواہرات سے موسمِ بہار کی منظر کشی کی گئی تھی۔ زمرد سے سبزہ، پکھراج سے جڑاؤ لیں ہوئے چاندی

کے درخت، ریشم کے پتے، مختلف جواہرات کے پھل اِس خوبصورتی سے بنائے گئے تھے کہ عقل حیران رہ جاتی تھی۔ موسمِ بہار گزر جانے کے بعد، اسے بچھا کر اس پر شراب نوشی کی محفلیں رچائی جاتی تھیں اور موسمِ بہار کا لطف اٹھایا جاتا تھا۔

یہ کروڑوں روپے کا سامان اُن غریب مسلمان فوجیوں نے جمع کیا تھا جن کے بدن پر کپڑے بھی سالم نہ تھے۔ مگر ایمان اور دیانت کی دولت سے ان کے سینے مالا مال تھے۔ حضرت عمرؓ کو بھی اسلامی فوج کی اس دیانت و امانت سے خوشی ہوئی اور ان کی تعریف کی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: اے عمر! جب تم اخود دیانتدار ہو تو عوام دیانتدار کیوں نہ ہوں؟

اس ساز و سامان کے علاوہ جو مدینہ منورہ بھیجا گیا، عام غنیمت اہلِ لشکر میں تقسیم کر دی گئی۔ خمسِ غنیمت نکال کر ہر سپاہی کو بارہ ہزار دینار تقسیم کیے گئے۔ اس کے علاوہ جن لوگوں نے مدائن میں رہنا چاہا ان کو خالی گھر بھی دیے گئے۔

مدینہ منورہ جو ساز و سامان بھیجا گیا اسے وہاں تقسیم کر دیا گیا حتیٰ کہ "بہار" کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر کے تقسیم کر دیا گیا۔ اب اس بہار سے لطف اٹھانے والا وہاں کون تھا۔

فتح جلولا

مدائن پر لشکرِ اسلام کے قبضہ کے بعد، ایرانی فوج کے افسر اور بچے کھچے سپاہی جلولا پہنچے اور وہاں نئے سرے سے اپنے آپ کو منظم کیا۔ مہران کو سپہ سالار بنایا گیا۔ اور قلعہ اور شہر کو محفوظ کرنے کے لیے چاروں طرف خندق کھدوائی گئی۔ اور شہر کے تمام راستوں پر لوہے کے گوکھرو بچھوا دیے گئے۔ ایرانیوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ اپنی پوری طاقت یہاں صرف کر دیں گے۔ اور لشکرِ اسلام کے سیلاب کو یہاں روک کر رہیں گے۔ کسریٰ یزدگرد، جو مدائن سے نکل کر حلوان پہنچ گیا تھا، وہاں سے امدادی

فوجیں بھیج رہا تھا۔ اس کی امیدوں کا آخری سہارا بھی یہی معرکہ تھا۔

حضرت سعد کو جب یہ اطلاعات ملیں تو انھوں نے دارالخلافہ میں قاصد بھیج کر حضرت عمر فاروق سے ہدایات طلب کیں۔ حضرت فاروق نے حکم بھیجا کہ سعد مدائن ہی میں مقیم رہیں اور اپنے بھتیجے ہاشم بن عتبہ کو بارہ ہزار مجاہدین کے ساتھ ایرانیوں کے مقابلہ کے لیے جلولا روانہ کریں۔ چنانچہ صفر ۱۶ھ میں ہاشم بن عتبہ نے جلولا پہنچ کر شہر کا محاصرہ کرلیا۔ یہ محاصرہ کئی ماہ جاری رہا۔ ایرانی شہر سے نکل کر حملہ کرتے تھے اور پھر خندق پار کرکے شہر میں چھپ جاتے تھے۔ اس طرح بہت سے معرکے ہوئے۔ چونکہ دونوں طرف سے جان توڑ مقابلہ ہوتا تھا، اس لیے فتح و شکست کا کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔

آخر ایک دن مقدمۃ الجیش کے افسر، قعقاع نے ایرانیوں پر زبردست حملہ کیا اور ان کو پیچھے ہٹاتے ہوئے شہر کے دروازہ تک پہنچ گئے۔ اور نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ ایرانی گھبرا کر پیچھے ہٹے اور قعقاع کے دستہ کے سپاہی شہر میں گھس گئے۔ ایرانیوں نے شہر سے باہر بھاگنے کا ارادہ کیا مگر راستے تو کانٹوں سے بھرے ہوئے تھے۔ بھاگنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ آخر مجاہدینِ اسلام نے ہزاروں کو تہ تیغ کیا۔ اور ایرانیوں کے کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ تقریباً ایک لاکھ ایرانی اس لڑائی میں مارے گئے۔ اور بے شمار مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ بچے کھچے ایرانی حلوان کی طرف بھاگے۔ یزدگرد کو شکست کی خبر ملی تو وہ حلوان سے رے کی طرف نکل گیا۔ ادھر قعقاع نے حلوان کا رُخ کیا۔ ایرانیوں نے مقابلہ کیا مگر شکست کھائی اور لشکرِ اسلام کا یہاں بھی قبضہ ہوگیا۔

حضرت سعد نے حلوان میں اسلامی فوج کی ایک چوکی مقرر کی کیونکہ یہ عراق عرب کا سرحدی مقام تھا۔ یہیں سَوَاد اور جبل کی حدیں آکر ملتی تھیں۔

پھر حضرت سعد نے مالِ غنیمت جمع کیا۔ یہ علاوہ ساز و سامان کے تین کروڑ

کی رقم تھی۔ اس میں سے خمس، جو بیت المال کا حصہ تھا، زیاد کے ہاتھ، جو فوج کے افسرِ مالیات تھے، مدینہ منورہ روانہ کیا اور خلیفۃ المومنین سے آئندہ کے لیے ہدایات طلب کیں۔ زیاد یہ مال و دولت لے کر عصر کے بعد مدینہ منورہ پہنچے اور مسجدِ نبوی کے صحن میں اس کا ڈھیر لگا دیا۔ تھوڑی دیر بعد اندھیرا ہو جانے کی وجہ سے وہ اس وقت تقسیم نہ ہو سکا۔ اہلِ مدینہ کی موجودگی میں زیاد نے ایک مفصّل اور پُر اثر تقریر میں لشکرِ اسلام کی شاندار کامیابی اور ایرانیوں کی پسپائی کے حالات سنائے۔ حضرت فاروق نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور زیاد کے حُسنِ تقریر کی تعریف کی۔ زیاد نے کہا: ہمارے سپاہیوں کے کارناموں نے ہماری زبانیں کھلوا دی ہیں۔ دوسرے روز صبح کو مالِ دولت کے انبار پر سے چادر ہٹائی گئی اور اہلِ مدینہ میں اسی وقت اسے تقسیم کر دیا گیا۔

مگر حضرت فاروق پر اس جواہرات، یاقوت، زبرجد اور سونے چاندی کے انبار کو دیکھ کر گریہ طاری ہو گیا۔ صحابہ نے پوچھا، امیر المومنین! یہ تو خوشی کا موقعہ ہے، آپ روتے کیوں ہیں؟ حضرت فاروق نے فرمایا: بھائیو! جب دولت آتی ہے تو اپنے ساتھ رشک و عداوت بھی لاتی ہے، اور جس قوم میں رشک و عداوت پیدا ہو جاتی ہے اس کی ہیبت باقی نہیں رہتی۔ مجھے ڈر ہے کہ دولت کی وجہ سے مسلمانوں میں اختلافات پیدا نہ ہو جائیں۔

فتحِ تکریت ابھی حضرت سعد مدائن ہی میں تھے کہ ان کو معلوم ہوا کہ موصل والے اپنے ایک سردار انطاق کے ماتحت تکریت میں مسلمانوں کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ انھوں نے حضرت عمر فاروق کے حکم کے مطابق، عبداللہ بن المعتمؓ کی افسری میں پانچ ہزار سواروں کی ایک جمعیت تکریت کی طرف روانہ کی۔

تکریت میں ایرانیوں، رومیوں اور عیسائی عربوں کا بہت بڑا لشکر

جمع تھا اور انھوں نے شہر کے گرد خندق کھود کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیا تھا۔ عبداللہ بن المعتم چالیس دن تک شہر کا محاصرہ کیے پڑے رہے اور اس دوران میں چوبیس مرتبہ ٹکراؤ ہوا۔ اگرچہ غیر مسلموں کی قوت کمزور ہوئی مگر یہ متحدہ فوج شکست نہ کھا سکی۔ اب عبداللہ بن المعتم نے خفیہ طور پر عیسائی عرب قبیلوں کو پیغام بھیجا کہ وہ اپنے ہم قوم عربوں کے ساتھ مل جائیں اور اسلام قبول کر کے دنیا اور آخرت کی کامیابی حاصل کریں۔ عرب عیسائیوں نے اسے قبول کیا اور طے پایا کہ جب مسلمان رات کو شہر کے دروازہ پر نعرۂ تکبیر بلند کریں تو شہر کے اندر سے وہ تکبیر کہیں۔

اس قرارداد کے بعد، رات کو عبداللہ بن معتم نے اپنے لشکر کے ساتھ تکریت کے دروازہ کے سامنے نعرۂ تکبیر بلند کیا، فوراً ہی اندر سے نومسلم عربوں نے نعرہ لگایا۔ ایرانی اور رومی سمجھے کہ مسلمان فوج شہر میں داخل ہو گئی ہے اور دروازوں کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ مگر دروازوں پر مسلمان تھے۔ انھوں نے ان بھاگتے ہوئے دشمنوں کو گھیر گھیر کر بے دریغ قتل کیا۔ اہلِ تکریت نے دریائے دجلہ پر اپنا قیمتی ساز و سامان کشتیوں میں لاد رکھا تھا، تاکہ اگر شکست ہو تو اسے لے کر نکل جائیں۔ مگر مسلمانوں نے ان سب کشتیوں پر قبضہ کر لیا۔ تکریت میں جو مالِ غنیمت ہاتھ لگا اسے خمس نکال کر تقسیم کر دیا گیا۔ ہر سوار کے حصہ میں تین تین ہزار آئے۔

فتح موصل

فتح تکریت کے بعد، ربعی بن الافکل کی ماتحتی میں ایک جمعیت فوراً ہی حصنین کی طرف روانہ کر دی گئی۔ حصنین موصل کی چھاؤنی تھی۔ ابھی ان کو تکریت کی لڑائی کا حال بھی معلوم نہ ہوا تھا کہ انھیں گھیر لیا گیا۔ انھوں نے صلح کی درخواست کی جسے قبول کیا گیا اور ان پر جزیہ لگا دیا گیا۔

حضرت عمرؓ نے، فتح مدائن کے بعد حکم بھیجا تھا کہ عراق کے مفتوحہ علاقوں میں

مفتوحین پر جزیہ لگا دیا جائے۔

خراج اور جزیہ "جزیہ" کے معنیٰ ہیں "بدلہ" کے۔ چونکہ مفتوحین کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر عائد ہوتی تھی اس لیے اُن سے اس کے عوض معمولی سا ٹیکس لیا جاتا تھا۔ جسے جزیہ کہتے تھے۔ جزیہ کی، ادا کرنے والے کی مالی حیثیت کے اعتبار سے تین شرحیں تھیں۔ اڑتالیس درہم اور چوبیس درہم اور بارہ درہم سالانہ، ایک درہم تقریباً ۴ر کا ہوتا تھا۔ یہ صرف ان لوگوں سے لیا جاتا تھا جن پر فوجی خدمات کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔

خراج، مالگذاری کی معمولی رقم تھی۔ یہ اُس رقم سے کم تھی جو مزروعہ زمینوں کے مالکوں سے ایرانی بادشاہوں کے عہد میں وصول کی جاتی تھی۔ مسلمان مالکانِ زمین کو اس کی بجائے عُشر یعنی پیداوار کا دسواں حصہ ادا کرنا پڑتا تھا۔

فتح ماسبذان جلولا کی فتح کے بعد حضرت سعد کو خبریں ملیں کہ ایرانیوں کا ایک اور گروہ ماسبذان کے گرد و نواح میں جمع ہو رہا ہے۔ حضرت عمر کے حکم کے مطابق ضرار بن الخطّاب کی ماتحتی میں اس کے مقابلہ کے لیے ایک لشکر بھیجا گیا۔ مقدمۃ الجیش میں ابن ہزیل اسدی تھے۔ انھوں نے آگے بڑھ کر ایرانی لشکر پر حملہ کر دیا۔ اور اس کے سالار آذبن کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ آذبن کا لشکر ماسبذان کی طرف بھاگا۔ ابن ہزیل نے اس کا پیچھا کیا اور اس کو شکست دے کر ماسبذان پر قبضہ کر لیا۔ یہاں کے باشندے بھاگ کر آس پاس کے پہاڑوں اور گھاٹیوں میں چھُپ گئے۔ ابن ہزیل نے شہریوں کے لیے امنِ عام کا اعلان کیا۔ وہ واپس آ گئے۔ اکثر نے اسلام قبول کر لیا۔ باقی پر جزیہ لگا دیا گیا۔

فتح قرقیسا و ہیت اسی طرح ایک اور لشکر حضرت سعد نے قرقیسا کی طرف بھیجا۔ اس لشکر کے سردار عمر بن مالک تھے

انھوں نے بزورِ شمشیر شہر فتح کر لیا۔ وہاں کے لوگوں کو بھی جزیہ کی ادائگی کے وعدہ پر امن دیا گیا۔

راستہ میں ہیت کے مقام پر بھی ایرانیوں سے ٹکراؤ ہوا۔ وہاں بھی انھوں نے خندق کھود رکھی تھی۔ پہلے انھوں نے مقابلہ کیا مگر پھر صلح کا پیغام بھیجا، چنانچہ ان کو بھی امان دی گئی اور ان پر جزیہ عائد کیا گیا۔ یہاں عراق کی حدود ختم ہوتی ہیں۔ پورا سوادِ عراق اب اسلام کے پرچم کے سایہ میں آگیا تھا۔

اب حضرت فاروق کے احکام کے مطابق، عراق کے نظم و نسق کا انتظام کیا گیا۔ اندرونی انتظامات کے لیے حاکم، قاضی اور افسرِ خراج مقرر کیے گئے۔ بیرونی حملوں سے حفاظت کے لیے جگہ جگہ مختلف مقامات پر چوکیاں قائم کی گئیں۔ حضرت سعد عراق کے صوبہ کے والی (گورنر) مقرر کیے گئے۔ وہ اس عہدہ پر ساڑھے تین سال رہے۔

یہ واقعات ۱۶ھ کے اواخر کے ہیں۔

آبادیِ بصرہ و کوفہ

مدائن کی فتح کے بعد، حضرت سعد بن وقاص نے وہیں قیام اختیار کرلیا تھا۔ مگر عرب اہلِ لشکر کو وہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی۔ ہر دارالسلطنت کی طرح وہ بہت بڑا اور گنجان شہر تھا جہاں تازہ اور صاف ہوا میسر نہ تھی اور مکھیاں اور غبار بکثرت تھے۔ عرب کھلی اور صاف ہوا میں اپنے مویشیوں کے ساتھ رہنے کے عادی تھے۔ چنانچہ ان کی صحت پر اثر پڑا۔ ان کے بدن لاغر اور چہرے زرد پڑ گئے۔ حضرت فاروق اعظم کی ہدایت پر حذیفہ اور سلمان نے سرزمینِ عراق کا چکر لگایا، دو شہروں کے لیے مناسب جگہیں تجویز کیں۔ اور بصرہ اور کوفہ بسائے گئے۔ پہلے بصرہ ربیع الاول ۱۶ھ میں آباد کیا گیا۔ اس کے لیے بندرگاہ اُبلّہ کے قریب، جہاں ہندوستان اور فارس کے جہاز لنگر کرتے تھے، جگہ انتخاب کی گئی۔ عربوں کے مذاق کے مطابق یہاں کی زمین کنکریلی تھی۔ آس پاس چراگاہیں تھیں۔ دریائے دجلہ بھی برابر سے گزرتا تھا۔ پہلے مرکز میں جامع مسجد بنائی گئی۔ اس کے قریب دارالامارہ (گورنمنٹ ہاؤس) تعمیر کیا گیا۔ ان کے گرداگرد شاہراہیں نکالی گئیں اور ان کے ساتھ ساتھ مختلف قبائل کے لیے محلے بسائے گئے۔

پہلے مکانات بانس اور لکڑی کے بنائے گئے مگر جب آگ لگنے کے حادثات زیادہ ہوئے تو اینٹ اور چونے کے اور پھر پتھر کے مکانات تیار کرائے گئے مگر حضرت عمر کا حکم تھا کہ تین کمروں سے زیادہ کا کوئی مکان نہ ہو۔ اگلے سال دریائے فرات کے مغربی کنارہ پر حیرہ کے قریب ایک دوسرا شہر کوفہ کے نام سے بسایا گیا۔ یہاں بھی بصرہ کے نقشہ کے مطابق پہلے بانس اور لکڑی کے، پھر اینٹ اور پتھر کے مکانات تعمیر کیے گئے۔ شہر کے وسط میں جامع مسجد اور دارالامارہ، جیل خانہ اور بیت المال کی عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ ۱۷ھ میں حضرت سعد،

اپنے ساتھیوں کے ساتھ مدائن سے کوفہ منتقل ہو گئے۔ بالائی عراق کا صدر مقام کوفہ اور زیریں عراق کا بصرہ قرار پایا۔ ان دونوں شہروں میں، اہلِ لشکر، اربابِ تجارت اور اصحابِ علم و فن دنیا کے مختلف حصوں سے آ آ کر آباد ہونے لگے اور جلد ہی ان کا شمار دنیا کے اہم شہروں میں ہونے لگا۔[1]

کوفہ اور بصرہ کے اسلامی مشرقی مقبوضات کی عظیم الشان چھاؤنیاں ہونے کی وجہ سے، جلیل القدر صحابہ اور تابعین یہاں مقیم ہوئے۔ یہ شہر ان بزرگوں کی وجہ سے، علومِ حدیث و فقہ و عربیت و صرف و نحو کے مرکز بن گئے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت حسن بصری، حضرت ابراہیم نخعی، امام شعبی، امام ابوحنیفہ رح جیسے اکابر محدثین و فقہا نے یہاں سے اپنا علمی فیض جاری کیا جس سے بلادِ فارس و ترکستان و سندھ سیراب ہوئے۔

فتح جزیرہ دجلہ اور فرات دریاؤں کے درمیان کا علاقہ "جزیرہ" کہلاتا ہے۔ یہ دیارِ مُضَر اور دیارِ بکر پر مشتمل ہے۔ اس کے خاص خاص شہر یہ ہیں: حرّان، رَہا، رُقّہ، راسِ عین، نصیبین، سنجار، نی پور، ماردین، آمد، میافارقین، موصل۔ یہ ایک طرف عراق اور دوسری طرف شام سے ملا ہوا ہے۔ جب عراق کے اکثر علاقے فتح ہو گئے تو ۱۷ھ میں شام کے میدان میں حضرت ابوعبیدہ کو اہلِ جزیرہ کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے حضرت عمر نے حضرت سعد کو جزیرہ پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا۔ چنانچہ کوفہ سے تین لشکر روانہ کیے گئے۔ ایک رقہ کی فتح کے لیے سہیل بن عدی کی سالاری میں، دوسرا نصیبین کی فتح کے لیے عبداللہ بن عتبان کی افسری میں، تیسرا عتبہ بن ولید کی قیادت میں جزیرہ کے عرب قبیلوں ربیعہ اور تنوخ کو زیر کرنے کے لیے۔ تینوں لشکروں کا سپہ سالارِ اعلیٰ عیاض بن غنم کو مقرر کیا گیا۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۵ و تاریخ الاسلام السیاسی ج ۱ ص ۳۹۹

عُیاض رہا پہنچے جو رومی حکومت کا اہم مقام تھا۔ یہاں کے حاکم نے معمولی مُزاحمت کے بعد جزیہ پر صلح کرلی۔ پھر حران کے باشندوں نے بھی ہتھیار ڈال دیے اور جزیہ دینا منظور کیا۔ پھر نصیبین اور آرمینیہ بھی فتح ہوئے۔ مگر جزیرہ کے عرب قبیلوں نے ہتھیار نہ ڈالے اور جزیہ کی ادائگی کو ذلّت سمجھ کر قبول نہ کیا، اور دھمکی دی کہ اگر مسلمانوں نے ان کو مجبور کیا تو وہ رومی علاقوں میں نکل جائیں گے۔ اسلامی لشکر کے افسروں نے حضرت عمرؓ کو تمام حالات سے مُطلع کیا اور لکھا کہ جزیرہ کے عربوں پر جزیہ سے دوگنی رقم ٹیکس کے طور پر لگادی جائے مگر اسے جزیہ نہ کہا جائے۔ حضرت عمرؓ نے اس کی منظوری دی اور جزیرہ کے عرب قبائل نے بھی مصالحت کرلی۔ اس طرح پورا جزیرہ اسلامی حکومت کے زیرِ اقتدار آگیا۔[1]

فتح اہواز خوزستان کا علاقہ عراق اور فارس کے درمیان واقع ہے اور اس کا مرکزی مقام اہواز ہے۔ اس کی حدود بصرہ اور سُوسْ سے ملی ہوئی تھیں، اور اس کا حاکم ہرمزان تھا جو شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور یزدگرد کے خاص اُمرا میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ ہرمزان اسلامی مفتوحہ علاقوں پر برابر حملے کرتا رہتا تھا، اس لیے عتبہ بن غزوان امیرِ بصرہ نے اس پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا اور حضرت سعد بن وقاص امیرِ کوفہ سے فوجی مدد چاہی۔ چنانچہ بصرہ اور کوفہ کے مشترکہ لشکر نے فرات اور نہرِ تیریٰ کے درمیان ہرمزان کو جالیا۔ اور اسے شکست دے کر نہرِ دجیل کے اُس پار دھکیل دیا۔ پھر ہرمزان نے صلح کی درخواست کی اور اہواز اور اس کے متعلقہ قصبے مسلمانوں کے حوالے کردیے۔ مگر کچھ عرصہ بعد اس نے صلح توڑ دی۔ حضرت عمرؓ کے حکم سے لشکرِ اسلام نے پھر ہرمزان پر حملہ کیا۔ سوقِ اہواز کے پُل پر مقابلہ ہوا

---

[1] تاریخ الامم الاسلامیہ (خضری) ص ۳۲۸

اور ہرمزان پھر شکست کھا کر رامہرمز میں محصور ہو بیٹھا۔ ہرمزان نے دوبارہ صلح کی درخواست کی۔ سپہ سالارِ اسلام نے اسے منظور کیا۔ حضرت عمر کو ہرمزان کی عہد شکنی سے شبہ ہوا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے صلح کی شرطوں پر پوری طرح عمل نہیں ہوا ہے۔ چنانچہ عتبہ بن غزوان کو لکھا کہ معززینِ بصرہ کا ایک وفد روانہ کریں۔ انھوں نے دس معتبر اشخاص کو، جن میں احنف بن قیس بھی تھے، مدینہ منورہ روانہ کیا۔ حضرت عمر نے خاص طور پر احنفؒ بن قیس سے کہا: میں تم پر بھروسہ کرتا ہوں۔ تم بتاؤ کہ مسلمان حکام کی طرف سے ذمیوں کے حقوق کی ادائگی میں کوتاہی تو نہیں ہو رہی ہے؟ کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ بار بار عہد شکنی کرتے ہیں۔ احنف اور دیگر اہلِ وفد نے کہا: امیر المومنین ہم تو ذمیوں سے برابر انصاف اور مہربانی کا برتاؤ کرتے ہیں مگر بات یہ ہے کہ یزدگرد برابر ان کو بھڑکاتا رہتا ہے۔ جب تک ہم کو فارس میں گھس کر اس کا قصہ ختم کرنے کی اجازت نہ دیں گے، امن و امان قائم نہ ہوگا۔ حضرت عمر اس جواب سے مطمئن ہو گئے، مگر پھر بھی امیرِ بصرہ کو لکھا: "دیکھو اللہ سے ڈرتے رہو، ذمیوں کے معاملہ میں تم سے کوئی بے انصافی یا ظلم نہ ہو، تمہیں جو کامیابی ہوئی ہے وہ اللہ کی مدد سے ہوئی ہے۔ تمہیں اللہ کی مدد اسی وقت تک حاصل رہے گی جب تک تم اپنے ماتحتوں کے حقوق کا خیال رکھو گے اور اس کی مخلوق کے ساتھ ظلم اور ناانصافی نہ کروگے"

بحرین سے فارس پر حملہ

علاء بن الحضرمی حضرت ابوبکر صدیق کے زمانہ سے بحرین کے امیر تھے۔ وہ ایک بہادر فوجی افسر تھے اور فوجی خدمات میں حضرت سعد سے ان کا مقابلہ رہتا تھا۔

جب انھوں نے عراق و فارس کی مہمات میں حضرت سعد کی کامیابیوں کا حال سنا تو انھیں خیال آیا کہ وہ بھی کوئی کارنامہ انجام دیں، چنانچہ انھوں نے بحرین سے فارس پر براہِ دریا حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا اور اپنے سپاہیوں

کو کشتیوں میں سوار کرا کر اصطخر کی طرف روانہ ہو گئے۔

اصطخر، فارس کا پرانا دار السلطنت تھا، اور ایرانیوں کی فوجی چھاؤنی بھی۔ مسلمان مجاہدین ساحل پر اترے تو ایرانیوں نے ان کا راستہ روکا اور سخت جنگ کے بعد ان کی کشتیوں پر بھی قبضہ کر لیا۔

طاؤس کے مقام پر ایک خونریز جنگ ہوئی۔ دونوں طرف کے بہادروں نے بہادری کے جوہر دکھائے۔ مسلمانوں نے ہزاروں ایرانیوں کو خاک و خون میں تڑپا یا مگر پھر بھی آگے نہ بڑھ سکے۔ اب انھوں نے دریا کے ہی راستہ بصرہ جانے کا ارادہ کیا مگر ایرانیوں نے ان کی کشتیوں کو ڈبو دیا تھا خشکی کے راستہ کو بھی ایک ایرانی فوجی افسر شہرک نے بند کر دیا تھا۔ اب مسلمان محصور ہو کر رہ گئے۔

حضرت عمر کو علار بن الحضرمی کے لشکر کی اس مصیبت کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے عتبہ بن غزوان کو حکم بھیجا کہ علار کے لیے فوجی امداد بھیجیں۔ انھوں نے ابو سبرہ بن ابو رہم کی قیادت میں بارہ ہزار کا لشکر روانہ کیا۔ یہ لوگ خشکی کے راستہ دریا کے کنارے کنارے اس مقام پر پہنچے جہاں علار کا لشکر محصور تھا۔ مجاہدینِ اسلام کو دشمنوں کے گھیرے سے نکالا۔ اور ایرانیوں کو شکستِ فاش دے کر بڑی مقدار میں مالِ غنیمت حاصل کیا۔ پھر دونوں لشکر بخیر و خوبی بصرہ واپس آئے۔

حضرت عمر سمندری لڑائی کے خلاف تھے۔ علار نے جو کچھ کیا تھا بغیر اُن کی اجازت کے کیا تھا۔ وہ ان پر بہت ناراض ہوئے۔ اور ان کو بحرین کی امارت سے معزول کر کے کوفہ جا کر حضرت سعد کی ماتحتی میں فوجی خدمات انجام دینے کا حکم دیا۔[1]

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۸۳

فتح رامہرمز و تستر

شہنشاہِ ایران یزدگرد مرو میں مقیم تھا۔ اور وہاں بیٹھ کر اہلِ فارس اور دوسرے علاقوں کے نوابوں اور جاگیرداروں کو بھڑکاتا رہتا تھا۔ جن مقامات پر ایرانی اُمرا مسلمانوں سے معاہدے کرکے صلح کر لیتے تھے، ان کو بھی عہد توڑنے پر اکساتا رہتا تھا۔ چنانچہ ہرمزان جو دو بار صلح کرکے رامہرمز میں مقیم ہوگیا تھا، کچھ عرصہ بعد یزدگرد ہی کے ورغلانے سے اس نے پھر عہد شکنی کی اور مسلمانوں کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔

حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو انھوں نے امیرِ کوفہ حضرت سعد بن وقاص کو حکم بھیجا کہ وہ نعمان بن مقرن کی ماتحتی میں ایک بڑا لشکر رامہرمز روانہ کریں۔ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری کو (جو اس وقت امیرِ بصرہ تھے) حکم دیا کہ وہ بھی ایک لشکر سہل بن عدیؓ کی افسری میں رامہرمز روانہ کریں اور دونوں لشکروں کے افسرِ اعلیٰ ابو سبرہؓ ابن ابی رہمؓ ہوں۔

چنانچہ پہلے کوفہ کا لشکر نعمان بن مقرن کی افسری میں نکلا اور رامہرمز کو گھیر لیا۔ ہرمزان نے سخت مقابلہ کیا مگر شکست کھائی اور تستر چلا گیا۔ نعمان رامہرمز پر قبضہ کرکے تستر کی طرف بڑھے۔ یہاں سہل بن عدی بھی بصرہ کا لشکر لے کر پہنچ گئے۔ ہرمزان نے بھی تستر کو اچھی طرح محفوظ کر رکھا تھا۔ اور اِدھر اُدھر سے ایرانیوں کی بہت بڑی جمعیت مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے جمع کر رکھی تھی۔ یزدگرد بھی اس کی پوری مدد کر رہا تھا۔ ہرمزان اپنی فوج کی کثرت کے بل بوتے پر شہر سے باہر نکل کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوتا۔ اسلامی لشکر بھی پوری طاقت سے اس کا جواب دیتا۔ یہ سلسلہ کئی ماہ جاری رہا۔ اس دوران اکثر معرکے ہوئے۔ کبھی مسلمان غالب آتے کبھی ایرانی۔ ان لڑائیوں میں مسلمانوں کا کافی نقصان ہوا۔ کئی ممتاز افسر کام آئے۔ اور ایرانیوں کے بھی ایک ہزار بہادر کام آئے۔

آخر اسلامی فوج کو ایک جاسوس نے بتایا کہ شہر کی فصیل کے نیچے ایک پوشیدہ نالہ ہے جس میں نہرِ دجیل کا پانی گزر کر شہر میں پہنچتا ہے۔ اسلامی لشکر کا ایک دستہ اس نالہ کے راستہ شہر میں داخل ہو گیا اور نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ ہرمزان سمجھا کہ شہر فتح ہو گیا۔ وہ اپنے قلعہ میں گھس کر محصور ہو گیا۔ مسلمانوں نے تستر پر قبضہ کر لیا۔ جب ہرمزان نے راہِ فرار نہ دیکھی تو ایک روز قلعہ کی دیوار پر کھڑے ہو کر کہا: میں آخری سانس تک مقابلہ کرتا رہوں گا۔ ہاں ایک صورت میں، میں اپنے آپ کو تمہارے حوالہ کر سکتا ہوں۔ تم مجھے خلیفۂ اسلام کے پاس پہنچا دو۔ وہ میرے حق میں جو بھی فیصلہ کر دیں گے وہ مجھے منظور ہو گا۔ سپہ سالارِ اسلام نے اسے منظور کر لیا اور ایک وفد کے ساتھ ہرمزان کو مدینہ منورہ روانہ کر دیا۔ ہرمزان کے ساتھ اس کے اہلِ خاندان اور اُمرا بھی تھے۔

شاہِ اہواز دربارِ خلافت میں

جب وہ مدینہ کے قریب پہنچا تو اس نے اپنا شاہی لباس، جسے وہ ساتھ لایا تھا، پہنا، ریشم کی قبا زیبِ تن کی، جواہرات سے جگمگاتا تاج سر پر رکھا، مُرصّع تلوار کمر پر باندھی اور نادر جواہرات سے اپنے آپ کو آراستہ کیا۔ اور ایک قیمتی گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ منورہ میں ایک جلوس کے ساتھ داخل ہوا۔ اہلِ مدینہ نے بادشاہ نہیں دیکھے تھے، وہ بھی اس کو دیکھنے کے لیے گھروں سے نکل آئے۔

امیر المومنین حضرت عمرؓ اس وقت مسجد کے صحن میں آرام کر رہے تھے۔ ہرمزان کو ان کے قریب لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔ ہرمزان کا خیال تھا کہ خلیفۂ اسلام جس کے دبدبہ سے ایران و روم کے بادشاہ لرزاں و ترساں ہیں، اس کا دربار بڑی شان و شوکت کا ہو گا۔ مگر حضرت عمر ایک ہاتھ کا تکیہ بنائے ہوئے سنگریزوں کے فرش پر لیٹے ہوئے تھے۔ کوئی سپاہی اور پہریدار بھی پاس نہ تھا۔

ہرمزان نے پوچھا: خلیفۃ المسلمین کہاں ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ یہی ہیں، تو

وہ حیران رہ گیا اور بولا یہ خلیفۂ اسلام کیسے ہو سکتے ہیں؟ نہ ان کا کوئی محافظ ہے نہ دربان۔ لوگوں نے جواب دیا، یہ کسی نگراں کو اللہ کے سوا پسند نہیں کرتے۔ ہرمزان بولا تو کیا یہ نبی ہیں؟ لوگوں نے جواب دیا، نبی تو نہیں مگر نبی کے جانشین اور اس کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہیں۔

اس گفتگو سے حضرت عمرؓ کی آنکھ کھل گئی۔ لوگوں نے بتایا کہ شاہِ اہواز حاضر ہے۔ حضرت عمرؓ نے سر سے پاؤں تک اس پر نگاہ ڈالی۔ پھر فرمایا اے ہرمزان! تم نے اپنی بار بار کی غداری کا انجام دیکھا۔ ہرمزان نے جواب دیا اے عمر جب ہم اور تم دونوں اللہ کے نافرمان تھے وہ نہ ہمارے ساتھ تھا اور نہ تمہارے ساتھ، تو ہم تم پر غالب تھے۔ مگر جب تم نے اللہ کی فرماں برداری اختیار کی اور ہم اس کے نافرمان رہے تو وہ تمہارا حامی و ناصر ہو گیا۔ اور اس نے تم کو ہم پر غالب کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ بے شک یہ صحیح ہے۔ اللہ نے اسلام کے ذریعہ ہم کو جو ٹکڑے ٹکڑے تھے متحد کر دیا، اور تم کو کفر کی پاداش میں متفرق کر دیا۔ یہ جو کچھ ہے اللہ کا فضل اور اس کے احکام کی تعمیل کا صدقہ ہے۔ پھر حضرت عمرؓ نے ہرمزان سے پوچھا، اچھا یہ بتاؤ کہ تم بار بار عہد شکنی کیوں کرتے رہے؟ ہرمزان نے کہا میں پیاسا ہوں، پانی پی کر جواب دوں گا۔ پانی آیا تو ہرمزان نے پیالہ ہاتھ میں لے کر کہا مجھ سے وعدہ کیجیے کہ جب تک یہ پانی نہ پی لوں مجھے قتل نہ کیا جائے گا۔ حضرت عمرؓ نے اسے اطمینان دلایا کہ ایسا ہی ہوگا۔ اب ہرمزان نے پانی بھرا پیالہ اُلٹ دیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اور پانی لاؤ۔ اسے پیاسا قتل نہ کرو۔ ہرمزان بولا، میں تو اب پانی ہی نہ پیوں گا۔ اور تم مجھے قتل بھی نہیں کر سکتے کیونکہ تم مجھ سے جب تک پانی نہ پیوں قتل نہ کرنے کا وعدہ کر چکے ہو۔ حضرت عمرؓ اس کی چالاکی پر حیران رہ گئے۔ حضرت عمرؓ نے اسے قبولِ اسلام کی دعوت دی۔ اس نے اسلام قبول کر لیا۔ حضرت عمرؓ نے دو ہزار دینار اس کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ اور مدینہ میں اس کے قیام کا مناسب انتظام کر دیا۔ حضرت عمرؓ کی زندگی بھر وہ

ایک سچے مسلمان کی طرح زندگی بسر کرتا رہا۔ مگر جب حضرت عمرؓ کو ایک ایرانی غلام ابو لؤلؤ نے نماز پڑھتے ہوئے شہید کر دیا تو اِس قتل کی سازش میں اُس پر شرکت کا الزام عائد کیا گیا۔

ذِمّیوں کا خیال

جو وفد ہرمزان کو لے کر آیا تھا، حضرت عمرؓ نے پھر اس سے پوچھا کہ ایرانی مفتوحہ علاقوں کے لوگ جو بار بار بغاوت کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ تو نہیں ہے کہ مسلمان حاکم اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہ کرتے ہوں اور ذمی مطمئن نہ ہوں۔ اہلِ وفد نے جواب دیا کہ ہم ان کے حقوق ادا کرنے میں کوئی کمی نہیں کرتے، مگر شہنشاہِ ایران برابر ان کو ورغلاتا رہتا ہے۔ جب تک آپ ہمیں فارس کے علاقہ میں پیش قدمی کرنے اور کسریٰ کے فتنہ کی جڑیں کاٹ دینے کی اجازت نہ دیں گے، بغاوت اور عہد شکنی کا سلسلہ جاری رہے گا۔ بھلا ایک ملک میں دو حکومتیں کیسے چل سکتی ہیں۔ ہرمزان نے بھی اس کی تائید کی۔ اب حضرت فاروقِ اعظمؓ کو اس معاملہ میں اطمینان ہو گیا۔ اور آپ نے فارس کے غیر مقبوضہ علاقوں میں اسلامی لشکر کو پیش قدمی کی اجازت دے دی۔

معرکۂ نہاوند

جب مسلمانوں نے خوزستان بھی فتح کر لیا اور شاہِ اہواز ہرمزان بھی گرفتار ہو کر مدینہ منورہ پہنچ گیا تو یزدگرد، جو اس وقت مرو میں مقیم تھا، بہت تلملایا اور اس نے ایران سے خراسان اور سندھ تک اپنے نقیب بھیجے اور تمام ممالکِ مقبوضہ سے فوجیں جمع کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ ڈیڑھ لاکھ سپاہی جمع ہوئے، جنہیں ہرمزان کے بیٹے مردان شاہ کی سالاری میں نہاوند کی طرف روانہ کیا گیا۔ نہاوند ہمدان کے جنوب میں بلادِ جبل کا صدر مقام تھا۔

مدینہ منورہ یہ خبریں پہنچیں تو حضرت عمرؓ نے اکابر صحابہ سے مشورہ کیا۔ آخر یہ طے ہوا کہ حضرت نعمان بن مقرن کی سربراہی میں تیس ہزار کا لشکر مقابلہ کے لیے بھیجا جائے۔ چنانچہ نعمان مجاہدین کے اس لشکر کو لے کر جس میں حضرت حذیفہ بن الیمانؓ، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت مُغیرہؓ بن شُعبہؓ، عمرو بن مَعدِی کَرِبؓ شامل تھے، نہاوند کی طرف روانہ ہوئے۔

اسلامی لشکر نہاوند کے قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایرانیوں کا ٹڈی دل لشکر نہاوند میں شہر کی فصیل میں محفوظ ہے۔ اور انھوں نے اپنی حفاظت کا پورا انتظام کر لیا ہے۔

نعمان نے قعقاع کو کچھ فوج دیکر آگے بھیجا کہ شہر پر حملہ کریں۔ ایرانیوں نے میدان میں ہر طرف گوکھرو بچھا دیے تھے، جس کی وجہ سے مسلمانوں کو آگے بڑھنا مشکل تھا۔ وہ جب خود چاہتے تو شہر سے نکل کر حملہ کرتے۔ اور پھر اندر جا کر محفوظ ہو جاتے۔

قعقاع نے لڑائی چھیڑ کر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ ایرانی آگے بڑھتے چلے آئے۔ یہاں تک کہ گوکھرو کی حد سے باہر آ گئے۔

نعمان منتظر ہی تھے، انھوں نے موقعہ دیکھ کر اپنی پوری جمعیت کے ساتھ ایرانیوں پر حملہ کر دیا۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ اور میدان خون سے بھر گیا۔ اتفاق سے اس خون کی کیچ میں نعمان کا گھوڑا پھسلا اور کسی ایرانی نے موقعہ دیکھ کر ان کا کام تمام کر دیا۔ نعمان کی ہدایت کے مطابق ان کے بھائی نعیم بن مقرن ان کی کلاہ اور سفید قبا پہن کر ان کا جھنڈا ہاتھ میں لے کر ان کی جگہ کھڑے ہو گئے۔ کسی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ سالارِ لشکر شہید ہو گیا ہے۔

حضرت حذیفہ بن الیمان نے جو نعمان کے بعد لشکر کی سرداری کر رہے تھے، ایرانیوں پر پوری طاقت سے حملہ کیا۔ رات ہوتے ہوتے ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔

لشکرِ اسلام کی فتح ہوئی۔ مسلمانوں نے ہمدان تک دشمن کا پیچھا کیا۔ لشکرِ اسلام فاتحانہ نہاوند میں داخل ہوا۔ وہاں بے شمار زر و جواہر ان کے ہاتھ لگا، جسے فتح کی خوشخبری کے ساتھ مدینہ منورہ بھیج دیا گیا۔

حضرت عمر فاروق کو نعمان اور دوسرے بہادرانِ اسلام کی شہادت کی خبر ملی تو بے اختیار رونے لگے۔ جواہرات پیش کیے گئے تو ان کی طرف رُخ بھی نہ کیا۔ چار کروڑ درہم میں فروخت کیے گئے اور مسلمانوں میں تقسیم کر دیے گئے۔

تسخیرِ ایران

حضرت عمر کا ارادہ ایران کی مکمل تسخیر کا نہ تھا، بلکہ مقصد یہ تھا کہ عربی علاقے ایرانیوں کے قبضہ سے نکال لیے جائیں اور ان کو ایسا محفوظ کر دیا جائے کہ ایرانی ان پر حملہ آور نہ ہو سکیں۔

حضرت عمر فرمایا کرتے تھے کہ "کاش ہمارے اور فارس کے درمیان آگ کا پہاڑ ہوتا کہ نہ ہم ان تک پہنچ سکتے اور نہ وہ ہم تک"

مگر ایرانی اپنی عظیم شہنشاہیت کی شکست دریخت گوارا نہ کر سکتے تھے، اور شہنشاہِ ایران شکست کھا کر جہاں بھی پہنچتا نئے سرے سے اپنی طاقت کو جمع کرتا۔ مسلمانوں کے مقبوضہ علاقوں میں بغاوت کراتا اور ایرانی سرداروں اور زمینداروں کو مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کے لیے اُبھارتا۔ اہواز اور نہاوند کے معرکے اسی فتنہ پردازی کا نتیجہ تھے۔

مسلمان افسروں اور حکام کی رائے تھی کہ جب تک یزدگرد ایران کی حدود سے باہر نہ کر دیا جائے فتنہ کی جڑ نہیں کٹ سکتی۔ اور اسلامی علاقوں میں امن و امان قائم نہیں ہو سکتا۔

آخر معرکۂ نہاوند کے بعد حضرت عمر فاروق کو بھی اس رائے سے اتفاق

کرنا پڑا کہ ایران میں عام لشکر کشی کی جائے اور سلطنتِ فارس کا نام و نشان مٹا دیا جائے۔

چنانچہ حضرت فاروقِ اعظم نے، ایران کے مختلف علاقوں پر حملہ آور ہونے کے لیے مختلف سردارانِ اسلام کو نامزد کیا اور ہر ایک کے لیے اپنے ہاتھ سے جھنڈے تیار کر کے عطا کیے:

۱۔ خراسان کا جھنڈا، احنف بن قیس تمیمی کو
۲۔ اردشیر خرہ و سابور کا، مجاشع بن مسعود سلمی کو
۳۔ اصطخر کا، عثمان بن ابی العاص ثقفی کو
۴۔ فسا و دراجرد کا، ساریہ بن زنیم کنانی کو
۵۔ کرمان کا، سہیل بن عدی کو
۶۔ سجستان کا، عاصم بن عمرو کو
۷۔ مکران کا، حکم بن عمیر تغلبی کو۔

یہ تمام سپہ سالارانِ اسلام فتح و نصرت کے جھنڈے اُڑاتے ہوئے اپنے اپنے نامزد علاقوں کی طرف روانہ ہوئے۔ اور سارا ایران مجاہدینِ اسلام کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے ہل گیا۔ بعض معرکوں کی تفصیل یہ ہے:

فتح اصفہان

سب سے پہلے، عبداللہ بن عبداللہ بن عتبہ اپنا لشکر لے کر اصفہان کی طرف بڑھے۔ اس کا دارالسلطنت جی تھا اور وہاں کا بادشاہ فاذوسفان۔ جب دونوں طرف کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں تو بادشاہ نے پیغام بھیجا کہ فوج کو کٹوانے کی ضرورت نہیں، ہم دونوں ایک دوسرے سے مقابلہ کر لیں، جو بھی جیت جائے لڑائی کا فیصلہ اس کے حق میں سمجھا جائے گا۔ عبداللہ بن عبداللہ نے یہ تجویز منظور کی اور گھوڑا دوڑا کر مقابلہ پر آ گئے۔ اور پوچھا کہ تم وار کرتے ہو یا میں وار کروں؟ فاذوسفان نے کہا: میں کرتا ہوں۔ چنانچہ اس نے تلوار کا وار کیا۔ عبداللہ نے بڑی بہادری سے

اسے روکا۔ وہ تو بچ گئے مگر لگام کٹ گئی اور زین اور نمد ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر گیا۔ عبداللہ گھوڑے کی ننگی پشت پر تلوار کھینچ کر کھڑے ہو گئے۔

اب عبداللہ کے حملہ کا نمبر تھا۔ فاذوسفان نے کہا، میں نے اپنی شکست مان لی اور تمہاری بہادری کا قائل ہو گیا۔ میں شہر اس شرط پر تمہارے حوالہ کرتا ہوں کہ جو یہاں رہنا چاہے وہ تم کو جزیہ ادا کرے اور جو نکل جانا چاہے تم اسے نکل جانے دو۔ عبداللہ نے یہ شرط منظور کی۔

اہلِ شہر نے جزیہ دینا منظور کیا۔ صرف تیس آدمی باہر نکل گئے۔ عبداللہ نے شہر کا انتظام ایک افسر کے حوالہ کیا اور خود سہل بن عدی کی مدد کے لیے کرمان کی طرف چلے گئے۔[1]

فتح ہمدان نہاوند کی فتح کے بعد مسلمانوں نے حلوان پھر ہمدان فتح کر لیا تھا۔ مگر معلوم ہوا کہ اہلِ ہمدان نے عہد شکنی کی۔ حضرت عمرؓ نے نعیم بن مقرن کو لکھا کہ وہ ہمدان کا رُخ کریں۔ چنانچہ پہلے وہ ثنیہ العسل پہنچے۔ وہاں سے ہمدان کا رخ کیا۔ پہلے اس کے اِرد گرد کے قصبات پر قبضہ کیا۔ جب اہلِ ہمدان محصور ہو گئے تو انھوں نے صلح کا پیغام بھیجا۔ نعیم بن مقرن نے جزیہ پر صلح کر لی اور فاتحانہ ہمدان میں داخل ہوئے۔

فتح واج رود نعیم بن مقرن ہمدان میں تھے کہ انھیں خبر ملی کہ ایرانیوں رومیوں اور دیلم کا ایک لشکر واج رود میں جمع ہو رہا ہے جو ہمدان اور قزوین کے درمیان ہے۔ وہ اُدھر بڑھے اور ان کے مقابلہ میں صف آرا ہوئے۔ دونوں طرف کے بہادروں میں ایک خوں ریز جنگ ہوئی۔ آخر کار فتح نے لشکرِ اسلام کے قدم چومے۔ اور دشمنوں کو سخت ہزیمت ہوئی۔ اس جنگ میں دیلم کا سردار موتا بھی لڑائی میں کام آیا اور

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۱۲۹

ان کی طاقت بھی ٹوٹ پھوٹ گئی۔ دیلم سے مسلمانوں کی یہ پہلی جنگ تھی۔ نعیم نے حضرت عمر کو اس مقابلہ کی خبر کردی تھی۔ حضرت فاروق کو اس کی بڑی فکر تھی۔ آخر مدینہ منورہ میں اس فتح کی بھی خوشخبری پہنچی تو حضرت فاروق کو بڑی خوشی ہوئی۔ آپ نے مسلمانوں کو مسجد میں جمع کیا اور سب کو فتح نامہ سُنایا۔ سب نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ پھر تین افسر مالِ غنیمت لے کر پہنچے اسے مسلمانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

پھر حضرت فاروق نے نعیم بن مقرن کو حکم بھیجا کہ ہمذان پر کسی کو اپنا قائم مقام بنا کر رَے کی طرف کوچ کریں۔[1]

دیگر فتوحات

اس کے بعد نعیم بن مقرن نے، رَے اور آذربیجان کو خوں ریز مقابلہ کے بعد فتح کیا۔ ان کے بھائی سوید بن مقرن نے پہلے قومس کو بے مقابلہ فتح کیا۔ پھر جرجان کو فتح کر لیا۔

فتح طبرستان اسپہبذ حاکمِ طبرستان (جو بلادِ خزر کے ساحل پر پھیلا ہوا ہے) نے یہ دیکھ کر کہ آس پاس کے حکمراں مسلمانوں کے آگے ہتھیار ڈال رہے ہیں، مسلمانوں سے صلح کرنے ہی میں عافیت دیکھی۔ چنانچہ سوید بن مقرن کو اس نے صلح کا پیغام بھیجا، جسے سوید نے منظور کر لیا۔ اور اہلِ جرجان کی شرائط پر صلح کر لی۔

دربند کی طرف پیش قدمی سراقہ بن عمرہ کے حکم سے، عبدالرحمٰن بن ربیعہ باب الابواب کی طرف بڑھے

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۱۲۱

جو دربند کے نام سے مشہور ہے اور جسے سدِّ سکندری کہا جاتا ہے۔ یہ ترکوں کا علاقہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے ان کی مدد کے لیے حبیب بن مسلمہ کو، جو جزیرہ کے حاکم تھے، بھیجا۔ شہر بزار یہاں کا حاکم تھا۔ اس نے عبدالرحمٰن کو بتایا کہ وہ اپنے پڑوسیوں ارمن اور قبج سے نفرت کرتا ہے جو اس کی مخالفت میں لگے رہتے ہیں، اور عربوں سے دوستی کرنا چاہتا ہے مگر وہ جزیہ کی ادائگی پسند نہیں کرتا۔ البتہ وہ مسلمانوں کی فوجی امداد کے لیے تیار ہے۔ حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع کی گئی اور انھوں نے فوجی امداد کی شرط پر، جزیہ کی ادائگی سے ترک حاکم کو مستثنیٰ کر دیا۔

اس کے بعد سراقہ بن عمرہ نے چار لشکر آرمینیہ کے ارد گرد کے علاقوں کی طرف روانہ کیے۔ مگر کامیابی سے پہلے ہی ان کا وقت آخر آگیا۔ تاہم ان کے نائب عبدالرحمٰن بن ربیعہ نے ان علاقوں میں سے اکثر کو فتح کر لیا۔

مگر ان دور دراز علاقوں میں مسلمانوں کے قدم مضبوطی سے نہ جم سکے اور یہ جلد ہی ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں ان کو دوبارہ فتح کرنا پڑا۔ یہ واقعہ ۲۲ھ کا ہے۔

فتحِ کرمان عاصم بن عمرہ نے ۲۳ھ میں سیستان، اور سہیل بن عدی نے کرمان فتح کر لیا۔ حکم بن عمرو تغلبی نے مکران (بلوچستان) فتح کیا۔ یہاں کے حاکم راجہ راسل نے، جو شہنشاہِ ایران کا باجگزار تھا، شکست کھائی۔ حکم نے مالِ غنیمت کے ساتھ چند ہاتھی بھی حضرت عمرؓ کی خدمت میں مدینہ منورہ بھیجے۔ صحار عبدی یہ خوشخبری اور مالِ غنیمت لے کر گئے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے یہاں کے حالات معلوم کیے اور حکم دیا کہ فی الحال اس طرف آگے نہ بڑھا جائے۔

یزدجرد شہنشاہِ ایران، مرو شاہ جہاں میں مقیم تھا۔ حضرت فاروقِ اعظمؓ نے احنف بن قیس کو اس کے تعاقب کے لیے بھیجا۔ یزدجرد وہاں سے نکل کر مرورود

چلا گیا اور وہاں سے خاقانِ چین اور دوسرے سرداروں کو مدد کے لیے خطوط بھیجے۔

یزدجرد خاقان کی پناہ میں

خاقان ایک زبردست فوج لے کر اس کی امداد کے لیے خراسان کی طرف بڑھا۔ مگر جلد ہی اسے مسلمانوں کی طاقت کا اندازہ ہو گیا اور اس نے سمجھ لیا کہ وہ اِن اللہ کے شیروں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ جلد ہی یزدجرد کا ساتھ چھوڑ کر اپنے ملک کو واپس چلا گیا۔

یزدجرد کو خاقان کی واپسی کی خبر ملی تو خزانے اور جواہرات لے کر ترکستان کا رُخ کیا۔ اس کے سرداروں نے جب دیکھا کہ ہزارہا سال کی ملکی و دولت ہاتھ سے نکلی جاتی ہے تو انھوں نے سب مال و دولت چھین لی۔ اور یزدجرد خالی ہاتھ خاقان کی پناہ میں پہنچا۔ اور مدتوں فرغانہ میں بے چارگی و بے کسی کی زندگی گذارتا رہا۔

احنف بن قیس نے حضرت فاروق کی خدمت میں فتح نامہ روانہ کیا۔ حضرت فاروق نے مسجدِ نبوی میں مسلمانوں کو جمع کر کے فتح کی خوشخبری سنائی اور فرمایا کہ:

الحمدللہ کہ آج مجوسیوں کی سلطنت غارت اور ان کی طاقت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے۔ اور اللہ نے ان کا ملک اور مال و دولت تمہارے حوالہ کر دیا ہے، تاکہ دیکھے کہ تم کیا عمل کرتے ہو۔ لہٰذا اس کی فرماں برداری سے غافل نہ ہو۔ ورنہ وہ یہ حکومت تم سے چھین کر کسی اور کو دے دے گا۔[1]

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۱۲۹

بقیہ فتوحاتِ شام

حضرت فاروق کے اول عہد میں، ۱۳ھ میں، ہم وادی یرموک میں مسلمانوں کو رومیوں کے مقابلہ میں فتح و نُصرت کے جھنڈے اُڑاتے چھوڑ آئے تھے۔ دوسری طرف عراق کے اکثر حصہ میں خلافتِ اسلامی کا اقتدار قائم ہو چکا تھا۔

حضرت فاروق نے دونوں محاذوں پر پیش قدمی کے احکام جاری کیے۔ عراق و ایران کی فتوحات کی تفصیلات ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور اس سلسلہ میں حضرت فاروق کے آخری زمانہ ۲۳ھ تک کے حالات کا ذکر کر چکے ہیں۔ تاکہ تسلسل قائم رہے۔

اب شام و فلسطین کی فتوحات کے حالات کی طرف لوٹتے ہیں۔

وادیِ یرموک میں رومیوں کا لشکر شرمناک شکست کھا کر بھاگا اور فحل جا کر رکا۔ فحل، حوران اور فلسطین کے درمیان ہے۔

حضرت فاروق کے حکم کے مطابق، اسلامی لشکر کا ایک حصہ عراق کی طرف روانہ کر دیا گیا اور ایک حصہ شکست خوردہ رومی فوج کے تعاقب کے لیے فحل روانہ کیا گیا۔ فحل کے مقام پر دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا، رومیوں کو یہاں بھی شکست ہوئی۔ اور فحل پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ یہاں سے حضرت ابو عبیدہ بن الجراح اور حضرت خالد بن ولید وغیرہ شام کے دار الحکومت دمشق پر حملہ کے لیے روانہ ہوئے۔

فتح دمشق دمشق سے پہلے غوطہ کو فتح کیا۔ پھر آگے بڑھ کر دمشق کا محاصرہ کر لیا گیا۔

ہرقل شہنشاہِ روم اس زمانہ میں بیت المقدس آیا ہوا تھا۔ اس نے مناسب

یہ سمجھا کہ حمص کو رومی لشکر کی چھاؤنی بنائے اور وہاں سے دمشق پر مسلمانوں کے حملہ کو روکے۔ چنانچہ دمشق سے وہ حمص آگیا۔ دمشق میں اس کا ایک سپہ سالار توذر بہت بڑا رومی لشکر لے کر اس کی حفاظت کر رہا تھا۔ دمشق کی فصیل بھی بہت بلند اور مضبوط تھی اور اس کے ارد گرد گہری خندق تھی جس میں پانی چھوڑ دیا گیا تھا۔ اور فصیل پر کافی تعداد سپاہیوں کی متعین کر دی گئی تھی اور منجنیق وغیرہ آلاتِ حرب نصب کر دیے گئے تھے۔

اس تمام انتظام کے باوجود، رومیوں کو میدان میں نکل کر مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ شہر کے دروازے بند کر کے محصور ہو کر بیٹھ گئے۔ لشکرِ اسلام نے شہر کا محاصرہ کیا تو شہر کے ہر دروازہ پر ایک ایک سالارِ لشکر کو اپنی جماعت کے ساتھ متعین کر دیا گیا۔ حضرت عمرو بن عاص، باب الفرادیس پر، شرجیل بن حسنہ باب توما پر، حضرت ابو عبیدہ باب الجابیہ پر اور حضرت خالد بن ولید باب الشرق پر متعین ہوئے۔ اس طرح تقریباً چھ ماہ یہ محاصرہ جاری رہا۔ رومی فصیل پر چڑھ کر کبھی کبھی پتھروں اور تیروں کا مینھ برساتے۔ ان کا خیال تھا کہ عرب شام کی سردی کو برداشت نہ کر سکیں گے اور کچھ دن بعد بھاگ کھڑے ہوں گے۔ مگر مسلمانوں کی گرم جوشی پر موسم کی سردی کا کچھ بھی اثر نہ پڑا۔ رومیوں کو یہ بھی توقع تھی کہ حمص سے امدادی فوج آجائے گی، مگر اسلامی سپہ سالار ذوالکلاع نے اسے بھی آگے نہ بڑھنے دیا۔

حضرت خالدؓ کی جرأتِ مردانہ

ادھر لشکرِ اسلام بھی زیادہ صبر نہ کر سکتا تھا۔ خاص طور پر حضرت خالد کی بے چین طبیعت کب ماننے والی تھی۔ آخر انھیں ایک روز اپنے جاسوسوں سے معلوم ہوا کہ بطریقِ شہر کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے اور شہر میں زبردست جشن منایا جا رہا ہے اور عام شہری اور فوجی دونوں دادِ عیش دے رہے ہیں، اور رقص و سرود اور شراب و کباب میں مست ہیں۔ انھوں نے کچھ رات گئے اپنے

ساتھ کچھ سپاہیوں کو لیا۔ مشکیں سینہ سے باندھ کر پانی سے لبریز خندق کو عبور کیا۔ پھر رسّیوں کی سیڑھیاں بنا کر، ان کے سِروں کو فصیل کے کنگروں سے اُلجھایا۔ اور ان کے ذریعہ فصیل پر چڑھ کر دوسری طرف اتر کر دروازہ کھول دیا۔ پھر اندر کی طرف سے نعرہ ہائے تکبیر بلند کیے۔ اِدھر بقیہ لشکر تیار کھڑا تھا، سیلاب کی طرح شہر میں گھس گیا۔ رومی حواس باختہ ہو کر بھاگے۔ اور ہزاروں قتل ہوئے۔ لشکرِ اسلام کُشتوں کے پُشتے لگاتا آگے بڑھتا گیا۔

اُدھر جو رومی افسر دوسرے دروازوں کے قریب تھے انھوں نے خود دروازے کھول دیے اور سپہ سالارانِ اسلام سے صلح کی درخواست کی۔ اِدھر کے سرداروں کو حضرت خالد کی کارگذاری کا علم نہ تھا۔ انھوں نے اسلامی طریقہ کے مطابق صلح کی درخواست قبول کرلی۔

اب، باب الشرق سے اسلامی فوج فاتحانہ اور دوسرے دروازوں سے مصالحانہ شہر میں داخل ہوئی۔ چاروں اسلامی سردار شہر کے وسط میں ملے، یوں نصف شہر صُلحاً اور نصف جبراً فتح ہوا تھا۔ مگر حضرت ابو عبیدہ نے سارے شہر کو صلحاً مفتوح قرار دیا۔ یعنی نہ کسی کا مال و سامان لوٹا گیا اور نہ کسی کو غلام بنایا گیا۔

معرکۂ مرج الرُّوم

دمشق کی فتح کے بعد، حضرت ابو عبیدہ نے، اس کی نگرانی اور انتظام کے لیے یزید بن ابی سفیان کو چھوڑا اور خود مرج الروم کی طرف بڑھے۔ یہاں لشکرِ روم کے دو بڑے سردار توذر اور شنس اپنی فوجیں لیے پڑے تھے۔ پھر معلوم ہوا کہ توذر اپنا لشکر لے کر دمشق کی طرف روانہ ہوا ہے۔ حضرت ابو عبیدہ نے حضرت خالد کو اس کا پیچھا کرنے کا حکم دیا۔ ادھر یزید بن ابی سفیان کو بھی توذر کی آمد کی خبر مل چکی تھی، انھوں نے دمشق سے نکل کر اس کا راستہ روکا۔ یہ دونوں فوجیں ایک دوسرے سے لڑ رہی ہی تھیں کہ پیچھے سے حضرت خالد نے آکر رومیوں پر حملہ کر دیا۔ رومی فوج چکّی کے دو پاٹوں میں پِس گئی اور ان میں سے کوئی زندہ نہ بچا۔

پھر یزید بن ابی سفیان دمشق میں چلے آئے اور حضرت خالدؓ ابو عبیدہ کے پاس لوٹ گئے۔

حضرت ابو عبیدہ کا حضرت خالد کے جانے کے بعد رومی سردار شنس سے مقابلہ ہوا۔ انھوں نے اسے شکستِ فاش دی۔

فتح حمص

حمص شام کے مشہور شہروں میں سے ایک شہر تھا۔ قیصرِ روم نے یہیں اپنا مرکز بنایا تھا۔ مگر جب اسے دمشق اور مرج روم کی شکستوں کی خبریں ملیں اور اسے اندازہ ہوا کہ اب لشکرِ اسلام حمص کا رُخ کرے گا تو وہ انطاکیہ چلا گیا۔

حضرت ابو عبیدہ بعلبک کو فتح کرتے ہوئے حمص کے قریب پہنچے۔ یہاں حضرت خالد بھی اُن سے آملے۔ رومیوں کی ایک جماعت شہر سے نکل کر مسلمانوں کے مقابل آئی، مگر حضرت خالد کے ایک ہی حملے نے ان کو پسپا کر دیا۔ پھر حضرت ابو عبیدہ نے آگے بڑھ کر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ رومی شہر کے دروازے بند کر کے بیٹھ گئے۔ سارا موسمِ سرما اسی حالت میں گذر گیا۔ رومیوں کا خیال تھا کہ عرب یہاں کی سردی کو برداشت نہ کر سکیں گے اور مجبوراً محاصرہ اٹھا کر چلے جائیں گے۔ مگر جب سارا موسمِ سرما گذر گیا اور مسلمانوں کے عزم و ہمت میں فرق نہ آیا اور رومیوں کے پاس رَسَد بھی ختم ہو گئی تو انھوں نے صلح کی درخواست کی۔ حضرت ابو عبیدہ نے صلح، دمشق کی شرائط پر منظور کر لی۔

پھر حماۃ پر، جو حمص اور قنسرین کے درمیان ہے، فوج کشی ہوئی۔ اہلِ حماۃ نے جزیہ کی شرط پر صلح کر لی۔ اس کے بعد سیرز اور معرہ پر بھی قبضہ ہوا۔

فتح قنسرین

حضرت ابو عبیدہ نے، حضرت خالد کو قنسرین کی طرف روانہ کیا۔ راستہ میں حاضر پڑتا تھا جو حلب کے قریب ہے۔ یہاں عربی قبیلے بڑی تعداد میں رہتے تھے۔ انھوں نے حضرت خالد کو لکھا کہ ہم تو تمہارے ہم قوم ہی ہیں، ہم لڑنا نہیں چاہتے۔ حضرت خالد نے ان سے صلح کر لی۔ رومی فوجی افسر میناس وہاں سے نکل بھاگا۔

پھر حضرت خالد قنسرین پہنچے۔ وہاں کے لوگ شہر کے دروازے بند کرکے بیٹھ رہے۔ حضرت خالد نے ان کو لکھا کہ اگر تم بادلوں میں بھی جا چھپو گے تو اللہ تعالیٰ ہم کو تمہارے پاس پہنچا دے گا اور تم کو ہمارے پاس اُتار لائے گا۔ انھوں نے اہلِ حمص کا انجام دیکھ کر صلح کا پیغام بھیجا۔ اور اہلِ حمص کی شرائط پر حضرت خالد نے ان سے بھی صلح کر لی۔

حلب

حضرت ابو عبیدہ، فتح قنسرین کے بعد حلب کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں معلوم ہوا کہ اہلِ قنسرین نے عہد شکنی کی ہے۔ ایک دستہ فوج ان کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا گیا۔ اہلِ قنسرین نے پھر اطاعت قبول کی اور بھاری تاوان بھی ادا کیا۔ حلب کے قریب پہنچ کر حضرت ابو عبیدہ نے صف آرائی کی اور عیاض بن غنم کو شہر کا محاصرہ کرنے کا حکم دیا۔ اہلِ حلب نے عیاض کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور جزیہ کی شرط پر صلح کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی۔

انطاکیہ

انطاکیہ شام کا مشہور تاریخی شہر اور قیصرِ روم کا گرمائی دارالسلطنت تھا۔ مسلمانوں کے طوفانی حملوں سے گھبرا کر آخر میں وہ یہیں آ گیا تھا اور شکست خوردہ رومی فوجیں ہر طرف سے سمٹ کر یہیں جمع ہو رہی تھیں۔ حلب وغیرہ کے بہت سے شہری عیسائی بھی، جو مسلمانوں کی حکومت میں رہنا نہیں چاہتے تھے یہیں اکٹھے ہو گئے تھے۔

رومی فوج کے سپاہی اور عام عیسائی، مسلمانوں کی پے در پے کامیابی سے حواس باختہ تھے۔ سب نے شہنشاہِ روم سے آہ و زاری کی اور اسے شرم و غیرت دلائی۔ قیصر مسلمانوں سے آخری ٹکر لینے کے لیے تیار ہو گیا، اور شام کے ہر حصہ میں احکام بھیج دیے کہ تمام رومی فوجیں انطاکیہ جمع ہو جائیں۔ چنانچہ انطاکیہ میں رومی فوجوں کا طوفان اُمنڈ آیا۔

مسلمان کیوں کامیاب ہیں؟

اسی زمانہ میں ایک روز قیصرِ روم نے، اپنے اُمرا اور سرداروں کو جمع کیا اور

اُن سے کہا: جو تم لوگ کہو گے میں وہ کروں گا اور اپنی طرف سے عربی لوگوں کے مقابلہ میں کوئی کسر نہ چھوڑوں گا، مگر تم یہ تو بتاؤ کہ عرب تم سے تعداد اور ساز و سامان میں بھی کم ہیں، پھر وہ اپنے ملک سے سیکڑوں کوس کے فاصلہ پر ہیں اور تم اپنے ملک اور وطن میں ہو، جو سہولتیں تم کو حاصل ہیں ان کو نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تم ان کے ہاتھوں مسلسل ذلیل ہو رہے ہو؟"

اس پر ایک تجربہ کار معزز شخص کھڑا ہوا۔ اس نے کہا: اے بادشاہ! تعداد میں وہ ہم سے کمتر ہیں، مگر اپنے اخلاق اور کردار کے لحاظ سے ہم سے بہت بہتر و برتر ہیں۔ وہ دن کو شہسوار ہیں اور رات کو عابد شب زندہ دار۔ سب ایک دوسرے کو بھائی سمجھتے ہیں، شراب نہیں پیتے، بدکاری نہیں کرتے، اپنے ماتحتوں پر ظلم نہیں کرتے، جو وعدہ کرتے ہیں اس کو پورا کرتے ہیں۔ اور ہمارا حال یہ ہے کہ بدکاری کے عادی ہیں، شراب کے رسیا ہیں، عہد و پیمان کا خیال نہیں کرتے، ماتحتوں اور کمزوروں پر ظلم کرتے ہیں، ہمارا ہر کام اخلاص اور جوش و خروش سے خالی ہوتا ہے۔ اِسی لیے اللہ تعالیٰ کی مدد ہمیں حاصل نہیں ہوتی۔

قیصر نے کہا بے شک یہی بات ہے، پھر اس نے رومیوں کو مسلمانوں سے آخری ٹکر لینے کا حکم دیا۔

حضرت ابو عبیدہ کو اِن تمام حالات کی اطلاع ہوئی۔ وہ حلب سے انطاکیہ کی طرف بڑھے۔ رومیوں نے شہر سے نکل کر مقابلہ کیا اور شکست کھا کر شہر میں محصور ہو بیٹھے۔ لشکرِ اسلام نے ان کے اردگرد فوجیں ڈال دیں۔ مجبور ہو کر اہلِ انطاکیہ نے صلح کا پیغام بھیجا اور جزیہ پر، اہلِ حلب کی شرائط پر صلح کر لی، مگر کچھ دن بعد پھر بدعہدی کی اور پھر صلح کی درخواست کی۔ حضرت ابو عبیدہ نے پھر درخواست منظور کی۔ مگر حضرت عمر کو لکھا کہ عیسائی بار بار عہد شکنی کرتے ہیں جس سے بہت دشواری پیش آتی ہے۔ حضرت عمر نے حکم دیا کہ ہر مفتوحہ علاقہ میں ایک دستہ فوج نگرانی کے لیے مقرر کیا جائے۔ اس کے اخراجات مرکزی بیت المال سے ادا کیے جائیں گے۔

فتحِ انطاکیہ کے بعد، اردگرد کے قصبات نے بھی مسلمانوں کی ماتحتی قبول کرلی اور بوقا، سرمین، توزی، قورس، تل، عزاز وغیرہ بغیر جنگ کے فتح ہو گئے۔

قیساریہ

قیساریہ جس کا دوسرا نام قیصریہ بھی تھا، بحرِ شام کے ساحل پر واقع ہے اور علاقۂ فلسطین میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ یہ اس زمانہ میں بہت بڑا شہر تھا جس میں تین سو بازار تھے۔ پہلے حضرت عمر کی خلافت کی ابتدا میں عمرو بن عاص نے اس کا محاصرہ کیا اور کافی دن تک اس کا محاصرہ کیے رہے، مگر فتح نہ ہو سکا۔ پھر قنسرین اور انطاکیہ کے بعد حضرت عمر نے حضرت معاویہ بن ابی سفیان کو اس طرف روانہ کیا اور ان کو لکھا کہ "میں نے تم کو قیساریہ کا حاکم مقرر کیا ہے، اللہ کا نام لے کر اُدھر جاؤ اور یہ دعا پڑھتے رہو:

"اَللّٰہُ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔ اَللّٰہُ رَبُّنَا وَثِقَتُنَا وَرَجَاؤُنَا وَمَوْلَانَا فَنِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ"

حضرت معاویہ نے ان پر کئی حملے کیے مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ آخر ایک روز ایک یہودی نے ایک خفیہ سُرنگ کا پتہ بتایا جو باہر سے قلعہ کے اندر تک گئی تھی۔ چنانچہ مسلمان سپاہی اس سُرنگ کے راستہ سے قلعہ کے اندر پہنچ گئے اور ساری فوج شہر میں دشمن کی فوج پر ٹوٹ پڑی۔ تقریباً ایک لاکھ رومی قتل ہوئے اور شہر فتح ہو گیا۔ بے شمار مالِ غنیمت ہاتھ لگا جو حضرت عمر کی خدمت میں فتح کی بشارت کے ساتھ بھیجا گیا۔

معرکۂ اجنادین

شام و فلسطین کے اکثر مقامات مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہو جانے کے بعد، قیصرِ روم نے ایک نہایت مدبّر اور چالاک افسر کو فلسطین کے علاقہ کا حاکم بنا دیا تھا جس کا نام "ارطبون" تھا۔ اس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ، بیت المقدس، غزہ اور رملہ مقامات میں فوجیں پھیلا رکھی تھیں۔ حضرت عمرو بن عاص نے، جن سے متعلق اس علاقہ کی مُہمّات تھیں، جب دیکھا کہ دشمن کی طاقت توقع سے زیادہ ہے، حضرت عمر کو اطلاع دی۔ حضرت عمر نے لکھا:

کچھ حرج نہیں، ہم نے رومی ارطبون سے اپنے ارطبون کو ٹکرا دیا ہے، دیکھو کون غالب آتا ہے۔ پھر اسلامی فوجوں کے سپہ سالاروں کو ان کی مدد کا حکم دیا۔

حضرت عمرو بن عاص اجنادین کی طرف بڑھے، جہاں اُس زمانہ میں ارطبون ایک لشکرِ عظیم لیے پڑا تھا۔ کافی مدت تک چھوٹے چھوٹے ٹکراؤ ہوتے رہے۔ سفیر بھی اِدھر سے اُدھر آتے جاتے رہے۔ مگر کوئی خاص نتیجہ نہ نکلا۔

آخر ایک دن حضرت عمرو بن عاص خود ارطبون کے لشکر میں، سفیر بن کر چلے گئے۔ ان کی گفتگو سے ارطبون سمجھ گیا کہ یہ کوئی بڑا سردار ہے جس سے حضرت عمر مشورہ لیتے اور اس کی بات مانتے ہیں۔ اس نے اپنے پہریداروں کو اشاروں سے ہدایت کی کہ واپسی کے وقت ان کو قتل کر دیا جائے۔

جب حضرت عمرو گفتگو ختم کرنے کے بعد چلنے لگے تو انھوں نے کہا، ہم دس آدمی ہیں جن کی رائے اور مشورہ سے ہمارے خلیفہ کام کرتے ہیں، میرا ارادہ یہ ہے کہ دوسرے نو سرداروں کو بھی کسی وقت لے آؤں تاکہ وہ بھی آپ کی بات سُن لیں اور سمجھ لیں۔ پھر بات ختم ہو جائے گی۔ ارطبون بہت خوش ہوا، کہ خلیفہ کے سب مُشیر اور بڑے افسر ایک ساتھ ہی ٹھکانے لگ جائیں گے۔ اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے۔ اور اپنے آدمیوں کو اشارہ سے عمرو بن عاص کو قتل کرنے سے روک دیا۔

جب عمرو بن عاص کئی دن تک واپس نہ آئے تو سمجھ گیا کہ اسلامی فوج کا سپہ سالار اُس سے زیادہ عقلمند ہے، وہی بے وقوف بن گیا۔

جب مُصالحت کی کوئی امید نہ رہی تو حضرت عمرو بن عاص نے پوری طاقت کے ساتھ حملہ کر دیا۔ رومیوں نے سخت مقابلہ کیا، مگر اسّی ہزار مقتولوں کو چھوڑ کر میدان سے بھاگے۔ مسلمانوں نے بھاگنے والوں کو راستہ دے دیا۔ اس کے بعد یافا، عسقلان، غزہ، رملہ، عکہ، بیروت، لد، جبلہ سب بغیر لڑائی کے فتح ہو گئے۔ صرف بیت المقدس باقی رہ گیا۔

فتح بیت المقدس

فلسطین کے صوبہ پر لشکر کشی کے لیے حضرت عمرو بن عاص مقرر کیے گئے تھے۔ جب فلسطین کے تمام اہم مقامات فتح ہو چکے، صرف بیت المقدس ہی رہ گیا تو حضرت عمرو بن عاص اُسی طرف بڑھے۔ حضرت ابو عبیدہ بھی دمشق کے اطراف سے فارغ ہو کر ادھر ہی آگئے۔

عیسائیوں نے افواجِ اسلامی کی آمد کی خبریں سنیں تو بیت المقدس کے دروازے بند کر کے بیٹھ رہے۔ جب محاصرہ نے طول کھینچا تو عیسائیوں نے اس شرط پر صلح پر آمادگی ظاہر کی کہ خود امیر المومنین حضرت عمرؓ آکر صلح نامہ لکھیں۔ کیونکہ ہمارے نبیوں کی کتابوں میں اس شخص کا حلیہ لکھا ہوا ہے جو ہمارے ہاتھوں سے بیت المقدس کی چابیاں لے گا۔ اگر تمہارا خلیفہ وہی ہوگا، تو ہم بغیر لڑے چابیاں اس کے حوالہ کر دیں گے۔ حضرت ابو عبیدہ نے مدینہ منورہ اطلاع دی۔ حضرت عثمان کی رائے یہ تھی کہ امیر المومنین کو جانے کی ضرورت نہیں۔ عیسائی مرعوب ہو چکے ہیں۔ وہ ہر حال میں ہتھیار ڈالیں ہی گے۔ مگر حضرت علی نے مشورہ دیا کہ جانا چاہیے تاکہ مسلمانوں کو محاصرہ کی تکلیف نہ ہو۔ حضرت عمر نے ان ہی کا مشورہ قبول کیا اور شام کی روانگی کا فیصلہ ہوا اور حضرت علی کو اپنا قائم مقام بنایا۔ اور حضرت عمر نہایت سادگی کے ساتھ روانہ ہوئے چند مہاجرین و انصار ساتھ تھے۔ سردارانِ فوج کو اطلاع دی جا چکی تھی کہ جابیہ میں آکر ان سے ملیں۔ چنانچہ حضرت ابو عبیدہ، حضرت یزید بن ابی سفیان اور حضرت خالد بن ولید جابیہ پہنچے۔ حضرت عمر کو دیکھ کر حضرت ابو عبیدہ گھوڑے سے اترے تو حضرت عمر بھی اتر پڑے۔ حضرت ابو عبیدہ نے ان کے ہاتھ چومنے کا ارادہ کیا تو حضرت عمر نے ان کے پاؤں چومنے کا قصد کیا۔ پھر حضرت ابو عبیدہ پیچھے ہٹے تو حضرت عمر بھی پیچھے ہٹ گئے۔

یہاں حضرت عمر نے دیکھا کہ سپہ سالارانِ اسلام ریشم و دیبا کے جُبّے اور قیمتی قبائیں پہنے ہوئے ہیں تو سخت ناراض ہوئے اور ان کی طرف کنکریاں پھینکنے کے لیے بڑھے تو سب نے معذرت کی کہ وہ جسم پر ہتھیار پہنے ہوئے ہیں اور ان ہتھیاروں

کے لیے ریشمیں کپڑے آرام دہ ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر یہ بات ہے تو کچھ حرج نہیں ہے[1]

ابھی قیام جابیہ ہی میں تھا کہ ایک دن ایک رومی فوجی دستہ ننگی تلواریں ہاتھ میں لیے ہوئے گھوڑے دوڑاتا آتا نظر آیا۔ مسلمان فوجی فوراً سنبھل کر کھڑے ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا خوف نہ کرو۔ یہ لوگ امن طلب کرنے آ رہے ہیں۔ چنانچہ جب یہ لوگ قریب آئے تو معلوم ہوا کہ رومی سردارانِ بیت المقدس کے نمائندے ہیں۔ انھوں نے رومی سرداروں کی طرف سے امن کی درخواست پیش کی۔ حضرت عمرؓ نے منظور فرمائی اور جزیہ کی شرط پر معاہدۂ صلح لکھا گیا، جس پر بڑے بڑے صحابہ کے دستخط ہو گئے۔

حضرت عمرؓ نے جابیہ ہی کے مقام پر ایک طویل موثر خطبہ دیا۔ جس میں مسلمانوں کو اتحاد و یک جہتی اور فکرِ آخرت کی تلقین کی گئی تھی۔

جب حضرت عمرؓ جابیہ سے روانہ ہوئے اور دمشق کے قریب سے گذرے تو وہاں کے شاندار محلات اور پُر فضا باغات اور عالی شان عمارات کے مناظر نگاہوں کے سامنے سے گزرے۔ آپؓ نے قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی:

كَمْ تَرَكُوا مِنْ جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ وَزُرُوعٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ وَنَعْمَةٍ كَانُوا فِيهَا فَاكِهِينَ كَذَٰلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ۔ (دخان ۲۵ تا ۲۸)

کیسے کیسے باغات اور چشمے اور کھیتیاں اور شاندار مقامات اور سامانِ نعمت جن میں وہ موجیں اُڑاتے تھے وہ چھوڑ گئے، ایسا ہی ہوا اور ہم نے دوسری قوموں کو ان کا وارث بنا دیا۔

مگر حضرت عمرؓ دمشق میں داخل نہیں ہوئے۔ چونکہ ان کے گھوڑے کے سُم گھس گئے تھے، اُن کی خدمت میں ایک اعلیٰ نسل کا گھوڑا پیش کیا گیا۔ حضرت عمرؓ اس پر سوار ہوئے تو

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۵۶

وہ اُلیلیں کرنے لگا۔ حضرت عمر یہ کہتے ہوئے اُتر گئے کہ "میں نے آج سے پہلے کسی کو شیطان پر سوار ہوتے نہیں دیکھا۔" پھر اپنے گھوڑے پر ہی سوار ہو کر چل دیے۔

جب بیت المقدس کے قریب پہنچے اور رومی سرداروں سے ملاقات کا وقت قریب آیا تو آپ کی خدمت میں عمدہ ریشمیں لباس پیش کیا گیا۔ آپنے پوچھا یہ کس کپڑے کا ہے۔ جواب دیا گیا کہ ریشم کا۔ آپنے فرمایا ہماری قوم کو جو کچھ عزت ملی ہے، وہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی بدولت دی ہے۔ ہمیں اس کے بعد کسی اور عزت کی ضرورت نہیں۔ پھر آپنے اپنی پھٹی پُرانی قمیص دُھلوائی۔ جہاں جہاں سے پھٹ رہی تھی، اسے سِلوایا پھر اسی کو پہن لیا۔[1]

ایک شامی عیسائی مورخ حتّی نے لکھا ہے کہ "بیت المقدس کے عیسائی پادریوں کی اپنی پُرانی کتابوں میں خلیفۃ المسلمین کی پہچان ہی یہ لکھی تھی کہ وہ بہت خستہ حال ہوگا۔ اس لیے عیسائی بطریقوں نے آپ کو دور سے دیکھتے ہی پہچان لیا اور بے تامل بیت المقدس کے دروازے کھول دیے۔"[2]

حضرت عمر بیت المقدس میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے مسجد اقصیٰ گئے۔ محراب داؤد کے پاس پہنچ کر دو رکعتیں تحیۃ المسجد ادا کیں۔ پھر عیسائیوں کے گرجا میں آئے۔ اور اِدھر اُدھر سیر کی۔ اسی دوران نماز کا وقت آگیا۔ بطریق ساتھ تھا۔ اس سے پوچھا نماز پڑھنی ہے، کہاں پڑھی جائے؟ بطریق نے جواب دیا، یہیں کہیں پڑھ لیجیے مگر آپ نے اسے پسند نہ کیا اور گرجا سے نکل کر سیڑھیوں پر نماز تنہا ادا کی۔ پھر بطریق سے فرمایا: اگر میں گرجا کے اندر نماز پڑھ لیتا تو میرے بعد مسلمان اسے تم سے چھین لیتے اور اسے مسجد بنا لیتے اور کہتے کہ یہاں امیر المومنین عمر نے نماز پڑھی ہے۔" پھر ایک تحریر لکھ دی کہ گرجا کی سیڑھیوں پر بھی جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھی جائے۔ پھر پوچھا کہ ہم مسجد کہاں بنائیں؟ رائے یہ ہوئی کہ صخرہ جس پر حضرت یعقوب نے

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۶۰ مطبوعہ بیروت [2] HITTI, HISTORY OF THE ARABS

اللہ تعالیٰ سے کلام کیا تھا اُس پر بنائی جائے۔ وہاں مزبلہ تھا، جس پر بہت گندگی پڑی ہوئی تھی۔ پہلے یہودیوں نے عیسائیوں کی دل آزاری کے لیے کنیسۂ قیامہ کو (جہاں ان کے خیال میں حضرت مسیح کو سولی پر لٹکایا گیا تھا) کوڑی گھر بنایا تھا، پھر تین سو سال قبل بعثت جب بیت المقدس پر عیسائیوں کا اقتدار ہوا تو انھوں نے یہودیوں کے صخرہ کو گندگی سے بھر دیا تھا۔ پہلے حضرت فاروق نے اس جگہ کو اپنی چادر سے صاف کرنا شروع کیا۔ پھر دوسرے مسلمان بھی لگ گئے۔ جب جگہ صاف ہو گئی تو وہاں مسجد تعمیر کی گئی۔

حضرت بلال وہاں موجود تھے۔ ایک روز ان سے اذان دینے کی درخواست کی گئی۔ حضرت بلال نے کہا: اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد میں نے اذان نہ دینے کا عہد کر لیا تھا، مگر آج آپ کا ارشاد بجا لاؤں گا۔ اذان کہنی شروع کی تو تمام صحابہ کو رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا زمانہ یاد آ گیا۔ اور عجب رِقّت کا سماں بندھ گیا۔

بیت المقدس یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں تینوں کے لیے مُقدّس مقام تھا۔ اس لیے اس کی ایک خاص اہمیت تھی۔ حضرت عیسیٰ کے زمانہ میں جب یہودی برسرِ اقتدار تھے تو انھوں نے حضرت مسیح اور ان کے پیروؤں کے ساتھ بڑے ظلم اور ناانصافی کا برتاؤ کیا۔ اس سے زیادہ ظلم کیا ہو سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کو قتل کرانے کی کوشش کی، اگرچہ اللہ نے ان کو بچا لیا اور زندہ اٹھا لیا۔ پھر جب شہنشاہِ فلسطین تیسری صدی ہجری میں اپنی قوم کے ساتھ عیسائی ہوا تو اس نے اور اس کے بعد کے بادشاہوں نے یہودیوں پر ظلم توڑے۔ ان کی عبادت گاہیں برباد کیں اور ان کو جلاوطن کیا۔ مگر مسلمانوں نے بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے بعد باشندگانِ بیت المقدس سے یہ معاہدہ کیا کہ:

(۱) سب کی جان مال، گرجے اور عبادت خانے محفوظ رہیں گے۔

(۲) کسی پر مذہب کے معاملہ میں جبر نہ کیا جائے گا۔ سب کو مذہبی آزادی حاصل ہو گی۔

(۳) جو کوئی شہر سے نکلنا چاہے گا اس کو پوری حفاظت کے ساتھ نکلنے کا موقعہ دیا جائے گا۔

(۴) جو شہر میں رہنا چاہے گا، اسے جزیہ کی معمولی رقم دینی ہوگی۔ اس کے عوض اس کو پورا امن اور فوجی خدمات سے آزادی حاصل ہوگی۔ ذمّی کی جان مسلمانوں کی جان کے برابر ہوگی۔

(۵) بیت المقدس کے عیسائی اگر رومیوں کے پاس جانا چاہیں گے تو ان کے پاس بھی جا سکتے ہیں اور ان کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔

البتہ بیت المقدس چونکہ عیسائیوں سے لیا گیا تھا اس لیے ان کی یہ شرط منظور کرلی گئی کہ ان کے پرانے دشمن یہودی وہاں نہیں رہیں گے۔

حضرت فاروقؓ نے فلسطین کی انتظامی سہولت کے لیے اسے دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ ایک کا صدر مقام رملہ بنایا گیا اور اس کا والی علقمہ بن حکیم کو مقرر کیا گیا اور دوسرے کا صدر مقام بیت المقدس اور اس کا والی علقمہ بن مجزز کو مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد حضرت فاروق واپس تشریف لے آئے۔

فتح بیت المقدس آخر ۱۵ھ یا ابتدا ۱۶ھ کا واقعہ ہے۔ یہ حضرت عمر فاروق کا پہلا سفرِ شام تھا۔

طاعون کی بلا

۱۷ھ میں، شام و فلسطین کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سفر کا ارادہ کیا۔ آپ مہاجرین اور انصار کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر نکلے۔ مگر جب سرحدِ شام پر، سرغ کے مقام پر پہنچے تو شامی لشکر کے افسر جو آپ کے استقبال کے لیے آئے تھے انھوں نے کہا کہ شام میں طاعون پھیل رہا ہے آپ آگے تشریف نہ لے جائیں۔

حضرت عمر نے اکابرِ مہاجرین کو جو فتحِ مکہ میں شریک تھے بُلایا اور ان سے مشورہ کیا۔ ان بزرگوں نے بالاتفاق مدینہ منورہ واپسی کا مشورہ دیا۔ حضرت عمر نے ان کے مشورہ کے مطابق اعلان کرا دیا کہ کل صبح واپسی ہے۔

مگر حضرت ابوعبیدہ بن الجراح نے اس فیصلہ سے اختلاف کیا اور کہا اے عمر! "کیا تقدیرِ الٰہی سے بھاگتے ہو"، حضرت عمر نے فرمایا "ہاں تقدیرِ الٰہی سے، تقدیرِ الٰہی کی طرف بھاگتا ہوں"، حضرت عمر کا مطلب یہ تھا کہ کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے تقدیرِ الٰہی ہی کے تحت ہوتا ہے۔ اگر میں یہاں سے جاؤں گا تو یہ بھی تقدیرِ الٰہی سے ہی ہوگا۔

ابھی یہ بحث ہو ہی رہی تھی کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف آگئے جو پیچھے رہ گئے تھے، انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "جب تم سنو کہ کسی شہر میں یہ وبا ہے تو وہاں نہ جاؤ، اور اگر تم کسی مقام پر ہو اور یہ وبا پھوٹ پڑے تو وہاں سے اس کے خوف سے نہ بھاگو"۔

حضرت عمر نے فرمایا، خدا کا شکر ہے کہ میرا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق ہے۔ پھر آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مدینہ منورہ واپس ہو گئے۔

آپ کے جانے کے بعد وبا شدت کے ساتھ پھیل گئی۔

حضرت فاروقِ اعظم کو حضرت ابو عبیدہ کا بہت خیال تھا۔ آپ نے ان کو پیغام بھیجا کہ مجھے تم سے بہت ضروری کام ہے، تم میرے خط کو دیکھتے ہی میرے پاس پہنچو۔ حضرت ابو عبیدہ نے جواب بھیجا: اے امیر المومنین! آپ کو مجھ سے جو کام ہے وہ مجھے معلوم ہے۔ میں مسلمانوں کے لشکر کو چھوڑ کر نہیں آسکتا۔ جو سب کا حال ہوگا وہ میرا بھی ہوگا۔

بہر حال رسول اللہ ﷺ کی جو حدیث حضرت عبد الرحمٰن بن عوف نے سنائی دونوں بزرگوں کا عمل اس کے مطابق ہی تھا۔ اور اس کی مصلحت بھی ظاہر ہے۔ اس وبا میں حضرت ابو عبیدہ بن الجراح، حضرت معاذ بن جبل اور حضرت یزید بن ابی سفیان جیسے اکابر صحابہ و افسرانِ لشکرِ اسلام اور بیس ہزار دوسرے فرزندانِ اسلام اللہ کو پیارے ہوئے۔

آخر میں حضرت عمرو بن عاص لشکرِ اسلام کے سپہ سالار ہوئے۔ انھوں نے مسلمانوں کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر کے، نشیبی علاقوں سے نکال کر پہاڑوں پر پھیلا دیا۔ اور مسلمانوں کو اس بلا سے نجات ملی۔

تیسرا سفرِ شام

جب وبا دور ہو گئی تو حضرت عمر فاروق نے شام کا تیسرا اور آخری سفر کیا۔ تاکہ وبا کی مصیبت نے جو مسائل پیدا کر دیے تھے اُن کا جائزہ لیں اور مناسب انتظامات عمل میں لائیں چنانچہ حضرت فاروق نے شام پہنچ کر مرنے والوں کے مالوں کو ان کے ورثا میں تقسیم کیا۔ جو عہدیدار وفات پا چکے تھے، ان کی جگہ دوسرے لائق لوگوں کو جنگی اور انتظامی مناصب پر مقرر کیا اور مفتوحہ علاقوں کے نظم و نسق کو درست کیا۔

رومی، مسلمانوں کی اس مصیبت سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ اور دوبارہ اپنے علاقوں کو واپس لینے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ حضرت عمر کے ان اقدامات سے ان کی آرزوؤں پر پانی پھر گیا۔ حضرت یزید بن ابی سفیان کی جگہ

حضرت فاروق نے ان کے لائق بھائی حضرت معاویہ بن ابی سفیان کو دمشق کا گورنر مقرر کیا۔ وہ اس کے بعد چالیس سال تک شام کے نظم و نسق کے مختلف حیثیتوں سے ذمہ دار رہے اور رومیوں کو کبھی انھوں نے سر اٹھانے کا موقعہ نہ دیا۔

اسی موقعہ پر ایک روز مسلمانوں نے حضرت عمر سے درخواست کی کہ وہ مؤذنِ رسول اللہ حضرت بلال سے اذان دلوائیں۔ حضرت عمر کی درخواست پر انھوں نے اپنی دل گداز آواز میں اذان دی۔ صحابۂ کرام کو رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا زمانہ یاد آگیا۔ اور اتنا روئے کہ آنسوؤں سے ڈاڑھیاں تر ہوگئیں۔ سب سے زیادہ رونے والے خود حضرت عمر فاروق تھے۔

عام الرّمادہ ۱۸ھ میں، مُلکِ حجاز میں زبردست قحط پڑا۔ بارش کے نہ ہونے سے کھیتیاں اور باغات سوکھ گئے۔ ہر طرف خاک اُڑتی نظر آرہی تھی۔ اسی لیے اس سال کا نام ہی عام الرمادہ (خاک والا سال) پڑگیا۔

مختلف علاقوں کے لوگ اپنے خاندان اور مویشیوں کو لے کر مدینہ منورہ جمع ہوگئے۔ حضرت عمر نے بیت المال میں جمع خوراک کے تمام ذخیرے خرچ کردیے، اور نقد روپیہ سے جو کچھ خریدا جاسکتا تھا وہ منگا کر تقسیم کردیا۔ نیز ابوموسیٰ اشعری کو بصرہ اور عمرو بن عاص کو مصر لکھا کہ امتِ محمد کی دستگیری کریں۔ چنانچہ دونوں ملکوں سے سامانِ خوراک سے لدے ہوئے اونٹوں کے قافلے آئے اور تقسیم ہوئے مصر سے سامان بحری راستہ سے بھی آیا۔ حضرت عمر کو اس بڑھاپے کے زمانہ میں روٹی دودھ اور چربی کے ساتھ کھانے کی عادت تھی۔ مگر اس قحط کے زمانہ میں آپ نے قسم کھالی کہ وہ بھی عام لوگوں کی طرح سرکہ اور تیل ہی استعمال کریں گے۔ اس خلافِ عادت خوراک سے وہ بہت کمزور ہوگئے۔ اور چہرہ کا رنگ بدل گیا۔ لوگوں نے بہت اصرار کیا کہ وہ قسم کا کفّارہ دے دیں مگر وہ نہ مانے۔

یہ مصیبت نو مہینے رہی۔ پھر ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

قبر مبارک پر حاضر ہو کر عرض کیا "یا رسول اللہ اپنی اُمت کے لیے سیرابی کی دُعا کیجیے وہ ہلاک ہوئی جا رہی ہے۔" رات کو انھوں نے حضورؐ کو خواب میں دیکھا۔ آپ نے ان سے فرمایا کہ عمر سے ہمارا سلام کہو اور ان سے کہو کہ وہ سمجھ سے کام لیں۔"

حضرت عمر نے اعلان کیا کہ لوگ نمازِ استسقا کے لیے نکلیں۔ پھر آپ حضرت عباس بن عبدالمطلب کو لے کر مدینہ سے باہر نکلے اور دو رکعت نمازِ استسقا ادا کی۔ اور بارگاہِ خداوندی میں ہاتھ اُٹھا کر عرض کیا:

"اے اللہ تیرے نبی کے زمانہ میں جب قحط پڑتا تھا تو ان کو وسیلہ بنا کر ہم دعا کرتے تھے تو تُو ہم کو سیراب کرتا تھا۔ اب ہم تیرے نبی کے چچا کو وسیلہ بنا کر دعا کرتے ہیں، تو ہم کو سیراب کر۔"

دعا بارگاہِ خداوندی میں مقبول ہوئی۔ ابھی لوگ راستہ ہی میں تھے کہ گھنگھور گھٹا اٹھی اور ایسی زبردست بارش ہوئی کہ سڑکیں تالاب بن گئیں۔ یہ بارش پورے مُلک کو محیط تھی۔ لوگ خوشی خوشی اپنے اپنے گھروں کو لوٹے[۱]

---

[۱] البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۹۰، ۹۱

فتحِ مصر

حضرت عمرو بن عاص، جو فتحِ فلسطین پر مامور تھے، جب فلسطین سے فارغ ہو چکے تو مصر فتح کرنے کا شوق ان کے دل میں چٹکیاں لینے لگا۔ وہ اسلام سے پہلے تجارت کے سلسلہ میں مصر جاتے رہے تھے۔ وہاں کی سرسبزی و شادابی اور زرخیزی کے مناظر ہمیشہ ان کی نگاہوں میں پھرتے رہتے تھے۔ حضرت فاروق کے شام کے سفر میں جب جابیہ میں اُن کی اِن سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے حضرت فاروق کو مصر کے حالات سنائے اور یہ بھی کہا کہ مصر رومیوں کی شہنشاہیت کا ایک اہم مرکز ہے، وہاں ان کی بڑی فوجی طاقت موجود ہے۔ اگر اسے فتح نہ کیا گیا تو شام کو بھی محفوظ نہ سمجھنا چاہیے۔ حضرت عمر پہلے تو انکار کرتے رہے، ان کی رائے یہ تھی کہ جو علاقے فتح ہو چکے ہیں پہلے ان کا پورا انتظام ہو جائے۔ مگر حضرت عمرو بن عاص کے شوق و اصرار کو دیکھا تو اجازت دے دی اور چار ہزار فوج ان کے ساتھ کر دی۔ پھر بھی انھوں نے یہ شرط لگا دی کہ مدینہ منورہ پہنچ کر مشورہ کے بعد اگر میری رائے بدلی تو تمہیں مطلع کر دوں گا، اگر حدودِ مصر میں داخل نہ ہوئے ہوں گے تو واپس آ جانا۔ اور اگر خط ملنے سے پہلے داخل ہو چکے ہوں گے تو اللہ کا نام لے کر آگے بڑھنا۔ حضرت عمر نے مدینہ منورہ سے جو قاصد بھیجا وہ عمرو بن عاص کو رفح کے مقام پر ملا۔ مگر انھوں نے وہاں یہ خط وصول نہیں کیا۔ جب حدودِ مصر میں عریش کے مقام پر پہنچے تو خط لیا۔ اس میں آگے بڑھنے سے روکا تھا۔ مگر چونکہ وہ اب حدودِ مصر میں داخل ہو چکے تھے، اس لیے اس ممانعت کے حکم پر عمل نہ کیا اور اپنا سفر جاری رکھا۔

فتح فرما حدودِ مصر میں پہلا شہر عریش تھا، مگر وہاں کوئی فوجی طاقت نہ تھی اس لیے وہ بلا مقابلہ فتح ہوا۔ پھر فرما پہنچے، یہ بحرِ روم کے کنارے پر ایک تاریخی شہر تھا۔ یہاں مضبوط قلعے اور شاندار گرجے اور فوج کی بڑی چھاؤنی تھی۔ یہاں کی رومی فوج نے شہر سے نکل کر مقابلہ کیا۔

مصر کے اصل باشندے قبطی تھے۔ وہاں کا فرماں روا مقوقس قبطی ہی تھا۔ سنہ ۳۰ ق م میں رومیوں نے اس پر قبضہ کر کے اسے اپنی نوآبادی بنالیا تھا۔ اور مقوقس قیصرِ روم کا باجگزار بن گیا تھا۔ رومی مصر کی زراعت و صنعت سے پورا فائدہ اٹھاتے تھے۔ انھوں نے ان پر بھاری ٹیکس لگا رکھے تھے یہاں تک کہ مُردوں کے دفن کرنے کا بھی محصول لیتے تھے۔ فوجی قبضہ رومیوں کا تھا اور اندرونی انتظامات مقوقس کے ہاتھ میں تھے۔ رومی فوج کے تمام اخراجات مصریوں کو ادا کرنے پڑتے تھے۔ اِن وجوہات سے قبطی رومیوں سے خوش نہ تھے۔ وہ اس معرکہ میں بظاہر رومیوں کے ساتھ تھے، مگر دل سے مخالف تھے۔ آخر رومیوں نے شکست کھائی اور فرما پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

فتح بلبیس فرما کے بعد عمرو بن عاص بلبیس پہنچے۔ وہاں ارطبون مشہور رومی سردار موجود تھا جو بیت المقدس کی فتح کے بعد یہاں چلا آیا تھا۔ ایک مہینہ تک شہر کا محاصرہ رہا۔ آخر اس پر بھی مجاہدینِ اسلام کا قبضہ ہوا اور شہر کے باشندوں نے جزیہ پر صلح کر لی۔ بلبیس میں شاہِ مصر مقوقس کی بیٹی ارمانوسہ مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہوئی۔ اس کی شادی قیصرِ روم کے بیٹے سے ہو گئی تھی، اور وہ رُخصت ہو کر سسرال جا رہی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اسے عزت و احترام کے ساتھ مقوقس کے پاس بھیج دیا۔ اس طرزِ عمل سے قبطیوں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے اور گنجائش پیدا ہو گئی۔

فتح اُمّ الدنین عمرو بن عاص یہاں سے چل کر ام الدنین پہنچے۔ رومی فوج قلعہ بند ہو بیٹھی۔ یہاں مسلمان کئی ہفتے حصار ڈالے پڑے

رہے۔ یہاں رومیوں کی بڑی طاقت تھی۔ مگر آخر اسے مسلمانوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اس کے بعد عمرو نے عین الشمس پر قبضہ کیا۔

فتح حصن بابلیون

اب ان کے سامنے حصن بابلیون کے سوا کوئی اور مضبوط چھاؤنی نہیں رہ گئی تھی۔ یہ جگہ ساحلِ نیل پر واقع تھی اور زمانہ بھی نیل کی طغیانی کا تھا۔ عمرو بن عاص اسلامی فوج کے ساتھ آگے بڑھے۔ اور قلعہ کو گھیر لیا۔ چونکہ قلعہ کی دیواریں بہت بلند تھیں، اس لیے محاصرہ توقع سے زیادہ تقریباً سات مہینے جاری رہا۔ حضرت عمرو بن عاص نے، حضرت فاروقِ اعظم کو حالات کی اطلاع دی اور ان سے فوجی مدد طلب کی۔ حضرت عمر نے چار ہزار فوج مزید روانہ کی۔ ان میں چار بڑے صحابہ کرام تھے۔ جن کے نام یہ ہیں: حضرت زبیر بن عوام، حضرت عبیدہ بن صامت، حضرت مقداد بن الاسود، حضرت مسلمہ بن مخلد۔ حضرت عمر نے یہ بھی لکھا کہ میں تمہاری مدد کے لیے چار ہزار سپاہی بھیج رہا ہوں۔ مگر ان میں چار ایسے بھی ہیں جن میں سے ہر ایک، ایک ہزار کے برابر ہے۔" اس امداد کے آنے سے مسلمانوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ مقوقس نے اپنے قاصد بھیج کر صلح کی درخواست کی جو منظور کی گئی۔

وہ قوم جسے موت، زندگی سے زیادہ عزیز ہے

جب مقوقس کے قاصد عمرو بن عاص کے پاس سے واپس آئے تو اُس نے اِن سے مسلمانوں کا حال پوچھا، انھوں نے کہا:

"اے بادشاہ ہم ایک ایسی قوم کے پاس سے آرہے ہیں جن کو موت زندگی سے اور عاجزی تکبّر سے زیادہ عزیز ہے، ان میں سے کسی کو دنیا سے کوئی رغبت نہیں ہے۔ وہ بے تکلف زمین پر بیٹھتے ہیں۔ ان میں بادشاہ اور سپاہی کا فرق نہیں ہے اور نہ غلام اور آقا میں کوئی امتیاز ہے۔ جب ان کی عبادت کا وقت آتا ہے تو وہ ہاتھ منہ دھوتے ہیں اور خدا کے

سامنے سربسجود ہو جاتے ہیں۔"
مقوقس نے کہا: ایسی قوم سے لڑنا بے کار ہے۔ اگر تم نے ان سے صُلح نہ کی تو تم کو اور زیادہ ذلیل ہونا پڑے گا۔[1]

صُلح پھر مقوقس نے پورے مصر کے لیے، مسلمانوں سے فی کس دو دینار سالانہ جزیہ کی ادائگی کی شرط پر صلح کا معاہدہ کر لیا۔ اور قیصرِ روم ہرقل کو بھی اس کی اطلاع دے دی۔ قیصر نے اسے منظور نہ کیا اور سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ تاہم مقوقس نے قیصر کو اطلاع دے دی کہ اس نے جو معاہدہ کر لیا ہے وہ اس پر قائم رہے گا۔ اس نے حضرت عمرؓ کو بھی اطلاع دے دی کہ وہ مسلمانوں سے اپنے وعدہ کو نباہے گا۔ چنانچہ اس کے بعد مقوقس نے مُصالحانہ طرزِ عمل اختیار کیا۔ قبطی اگلی لڑائیوں میں مسلمانوں کو ہر قسم کی مدد بہم پہنچاتے رہے۔ ان کے لیے راستہ ہموار کرتے رہے، پُل بناتے رہے، اور فوجوں کے قیام اور طعام وغیرہ کے انتظامات کرتے رہے۔

فتحِ اسکندریہ اسکندریہ مصر کا دارالحکومت اور سلطنتِ روم کا مشرقی مرکز اور دنیا کا عظیم الشان تجارتی شہر تھا۔ قیصرِ روم سمجھتا تھا کہ اس شہر کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد تمام مصر سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ اس لیے اس نے وہاں مسلسل فوجیں بھیجنی شروع کر دی تھیں۔ اور اس کے دفاع کے خشکی اور سمندری دونوں طرف سے مکمل انتظامات کر دیے تھے۔

مسلمانوں کے سامنے بھی اب یہی شہر تھا۔ چنانچہ اسلامی فوجوں کا سیلاب اسی طرف رواں ہوا۔ راستہ میں طرنوط، نقیوس، سلیطس اور آخر میں کریون فتح ہوئے۔ کریون اس راستہ کا آخری قلعہ تھا۔ یہاں رومیوں نے بڑی فوج جمع کر رکھی تھی۔ اور رومی سپہ سالار تھیودریہیں مزاحمت کے لیے موجود تھا۔ یہاں سخت مُقابلہ ہوا۔

---

[1] تاریخ الاسلام السیاسی مطبوعہ مصر ج ۱ ص ۱۸۲

آخر رومیوں کو شکست ہوئی اور بقیۃ السّیف یہاں سے بھاگ کر اسکندریہ میں پناہ گزیں ہوئے۔ اسکندریہ میں پہلے ہی رومیوں کی بہت فوج موجود تھی۔ شہر پناہ کی دیواریں بھی کافی مضبوط تھیں۔ حضرت عمرو چار مہینے تک شہر میں داخل ہونے کی کوشش کرتے رہے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ حضرت عمر فاروق بہت فکرمند تھے، انھوں نے عمرو بن عاص کو تنبیہ کی کہ آخر اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے، کیا تم بھی آرام طلب بن گئے۔ عمرو بن عاص نے حضرت عمر کا خط تمام مسلمانوں کو سنایا اور جہاد پر ایک پُرزور خطبہ دیا۔ پھر حضرت عبادہ بن صامت کو جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ممتاز صحابی تھے، بُلا کر اپنا عمامہ ان کے حوالہ کیا اور کہا کہ اب آپ سپہ سالار ہیں، اور حضرت زبیر اور مسلمہ بن مخلد کو فوج کا ہراول مقرر کیا۔ حضرت عبادہ فوج کے کچھ بہادروں کو ساتھ لے کر شہر کی طرف بڑھے اور اس جوش سے حملہ کیا کہ رومی قدم نہ روک سکے اور شہر فتح ہو گیا۔

حضرت عمرو نے تمام مصریوں کو امان دی اور جزیہ کی ادائگی پر اسکندریہ والوں سے بھی صلح کا معاہدہ کر لیا۔ اگرچہ رومی آخر وقت تک مقابلہ کرتے رہے تھے مگر ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جو قبطیوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اور ان کو اختیار دیا گیا کہ وہ چاہیں معمولی جزیہ دے کر مصر میں امن کے ساتھ رہیں۔ ان کی جانیں، مال و جائداد اور گرجے محفوظ رہیں گے۔ اور اگر وہ چاہیں تو پوری حفاظت جان و مال کے ساتھ جہاں چاہیں چلے جائیں۔ قبطیوں نے تو یہ سمجھا کہ ان کو غلامی کی زندگی سے نجات ملی ہے۔ ان کے مذہبی پیشوا البطریق بن یامین نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"آج میں شہر اسکندریہ میں نجات و اطمینان کا زمانہ پا رہا ہوں، جس کو میں تلاش کر رہا تھا۔ ان مظالم کے بعد جو کافروں کے ہاتھوں ہمیں برداشت کرنے پڑے"

حضرت معاویہ بن خدیج کو فتح کی خوشخبری دینے کے لیے مدینہ منورہ بھیجا گیا۔ حضرت فاروق ان کو لے کر مسجدِ نبوی میں گئے اور تمام مسلمانوں کو فتحِ مصر کا حال

سنایا اور بارگاہِ خداوندی میں سجدۂ شکر ادا کیا۔ فتح مصر ۲۰ھ کا واقعہ ہے۔

عروسۂ نیل مصر کی فتح جب مکمل ہو گئی اور حضرت عمرو بن عاص نے انتظامی امور کی طرف توجہ کی تو ان کے پاس مصریوں کا ایک وفد آیا۔ انھوں نے کہا: اے امیر! مصر ایک زراعتی ملک ہے اور یہاں کی زراعت کا دار و مدار دریائے نیل پر ہے، ہمارے یہاں قدیم زمانہ سے دستور چلا آرہا ہے کہ "بونہ" کے مہینہ کی بارہ تاریخ کو ایک کنواری لڑکی کو زیورات اور عمدہ ملبوسات سے آراستہ کر کے دریا کی بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ اب یہ مہینہ آگیا ہے۔ ہم آپ سے اس رسم کو منانے کی اجازت مانگنے آئے ہیں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو نیل دیوتا ناراض ہو جائے گا اور پانی نہ دے گا۔

حضرت عمرو بن عاص نے کہا کہ اسلام میں ان جاہلانہ خرافات کی اجازت نہیں۔ چنانچہ یہ رسم نہیں منائی گئی۔

پھر ایسا اتفاق ہوا کہ نیل میں واقعی پانی نہ آیا۔ اور کاشتکار لوگ گھر بار چھوڑ کر نکل جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔

عمرو بن عاص نے اس واقعہ کی اطلاع حضرت عمر فاروق کو دی۔ خلیفۃ المسلمین نے جواب دیا کہ تم نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ اب میں ایک پرچہ بھیج رہا ہوں اسے دریا میں ڈلوا دو۔ اس پرچہ میں لکھا تھا:

"اللہ کے بندے اور مسلمانوں کے امیر کی طرف سے نیل کے نام۔

اما بعد، اے نیل اگر تو اپنے ارادہ اور اختیار سے بہتا ہے تو نہ بہہ، ہمیں تیری کچھ ضرورت نہیں۔ اور اگر خداوند واحد قہار کے حکم سے بہتا ہے تو ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ تجھے جاری کر دے۔"

یہ پرچہ نیل میں ڈال دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا ایسا کرم ہوا کہ ایک ہی رات میں دریا ٹھاٹھیں مار کر بہنے لگا۔ اور اس میں سولہ گز پانی چڑھ گیا۔

اس طرح اسلام کے صدقہ میں مصر کی یہ قدیم مشرکانہ اور ظالمانہ رسم بند ہوئی۔[1]

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۱۰۱

آبادیِ فسطاط

مصر کے صوبہ کی فتح کے بعد، وہاں کے دارالحکومت کا مسئلہ سامنے آیا۔ اسکندریہ اپنی شان و شوکت اور عظیم الشان عمارتوں کی وجہ سے اس کے لیے موزوں تھا اور عرصۂ دراز سے وہی دارالحکومت چلا آرہا تھا۔ مگر حضرت عمرؓ نے اسے پسند نہ کیا۔ وہ ایسی جگہ چاہتے تھے جہاں جانے کے لیے اہلِ حجاز کو دریا پار نہ کرنا پڑے۔ پھر اسکندریہ ساحلِ سمندر پر ہونے کی وجہ سے، رومیوں کے حملہ کے خطرہ سے بھی محفوظ نہ تھا۔

آخر دریائے نیل اور جبلِ مقطم کے درمیان ایک پُر فضا مقام انتخاب کیا گیا۔ یہاں رومیوں کے زمانہ کا ایک قلعہ تھا جسے حصن بابلیون کہتے تھے۔ اس قلعہ کے شمال اور مشرق کی طرف کھجور اور انگور کے باغات تھے اور قلعہ اور پہاڑ کے درمیان چند گرجے اور خانقاہیں تھیں۔ یہ عرب کے شہروں سے قریب بھی تھا اور شمالی اور جنوبی مصری علاقوں کی یہاں سے اچھی طرح نگہداشت کی جا سکتی تھی۔ مسلمانوں کے دستور کے مطابق شہر کے وسط میں ایک عالی شان مسجد تعمیر کی گئی اور اس کے چاروں طرف قبائلِ عرب کے لیے الگ الگ محلے بسائے گئے۔ شروع میں یہاں کے مکانات یک منزلہ تھے۔ پھر جب آبادی بڑھی تو چھ سات منزل تک کے ہو گئے۔

چوتھی صدی کا ایک سیاح لکھتا ہے کہ "یہ شہر بغداد کو بھلا دینے والا، مغرب کا خزانہ اور اسلام کا فخر ہے۔ یہاں سے زیادہ کسی ساحل پر جہاز لنگر نہیں ڈالتے۔"

فسطاط عربی میں خیمہ کو کہتے ہیں۔ اس کی وجہ تسمیہ کے سلسلہ میں عجیب روایت ہے۔ کہتے ہیں کہ جب حضرت عمرو بن عاص مصر میں داخل ہوئے تو قصرِ شمع کے پاس لشکرِ اسلام خیمہ زن ہوا۔ جب وہاں سے آگے بڑھنے لگے تو لشکر کے خیمے اکھاڑے گئے۔ عمرو بن عاص کے خیمے میں کسی کبوتری نے گھونسلہ بنالیا اور بچے بھی دے دیے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے خیمہ کو نہ اکھاڑا جائے، ہمارے مہمان کو تکلیف ہوگی۔ چنانچہ آپکا خیمہ کھڑا رہنے دیا گیا۔ پھر جب یہاں دارالحکومت بسایا جانا طے ہوا تو شہر کا نام فسطاط ہی تجویز کیا گیا۔[1] یہ شہر فاطمیین کے زمانہ ۳۵۸ھ میں قاہرہ کی آبادی تک مصر کے اسلامی صوبہ کا دارالحکومت رہا۔

---

[1] تاریخ الاسلام السیاسی طبع مصر ج ۱ ص ۴۰۰

شہادتِ عمر فاروقؓ

مُجاہدینِ اسلام کے ہاتھوں لڑائیوں میں فریقِ مخالف کے جو لوگ گرفتار ہوتے تھے، وہ مجاہدین میں ہی تقسیم کر دیے جاتے تھے۔ وہ ان کو اپنے خاندان کے ایک رُکن کی حیثیت سے اپنے گھروں میں رکھتے تھے۔ جو خود کھاتے تھے وہی ان کو کھلاتے۔ اور جیسا خود پہنتے تھے ان کو بھی پہناتے۔ البتہ ان کو اپنی کمائی کا ایک حصہ اپنے آقاؤں کو دینا ہوتا تھا۔ یہ "موالی" کہلاتے تھے۔ یہ مولیٰ کی جمع ہے، جس کے اصل معنیٰ "آقا" ہیں۔ گویا اہلِ خاندان ان کو آقا سمجھتے تھے۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں فتوحاتِ فارس و شام کی وجہ سے ان موالی کی بڑی تعداد مدینہ منورہ میں جمع ہو گئی تھی۔ بظاہر انھوں نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی تھی مگر ان کے سینے حسد و انتقام کی آگ سے دہکتے رہتے تھے۔ یہ اپنی خفیہ مجلسوں میں مسلمانوں اور حکومتِ اسلامی کے خلاف اسکیمیں بھی بناتے رہتے تھے۔ مدینہ میں ان کا سرگروہ ہرمزان سابق شاہِ اہواز تھا۔

ایک روز حضرت عمرؓ حسبِ معمول بازار کا گشت کر رہے تھے کہ ایک ایرانی شخص ابو لؤلؤہ فیروز ان کے سامنے آیا اور کہا میں مغیرہ بن شعبہ کے یہاں رہتا ہوں۔ انھوں نے مجھ پر بہت زیادہ ٹیکس لگا رکھا ہے، آپ اسے کم کرا دیجیے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کتنا ٹیکس ہے؟ اس نے کہا دو درہم روزانہ یعنی تقریباً سات آنے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا تمہارا پیشہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: بڑھئی بھی ہوں، لوہار بھی اور نقاش بھی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تم تو بڑے کاریگر ہو۔ یہ ٹیکس تمہارے لیے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اور ہاں ہمیں یاد آیا، تم تو ہوا کے زور سے چلنے والی آٹا پیسنے کی چکی بھی بناتے ہو، ایک چکی ہمارے لیے بھی بنا دینا۔ فیروز نے بگڑ کر کہا میں تمہارے لیے

ایسی چکّی بناؤں گا جس کی مشرق و مغرب میں شہرت ہو جائے گی۔ یہ کہہ کر چلا گیا حضرت عمرؓ نے فرمایا ایک غلام نے مجھے ڈانٹ دیا۔ دوسرے روز صبح سویرے حضرت عمرؓ مسجد میں تشریف لائے اور نماز پڑھانے کے لیے محراب میں کھڑے ہو گئے۔ فیروز زہر میں بجھا ہوا ایک دو دھارا خنجر لیے ہوئے تاک میں کھڑا تھا۔ اس نے جھپٹ کر آپ کے شانہ اور ناف پر چھ وار کیے۔ آپ زمین پر گر پڑے اور گرتے ہوئے کہا کہ اگر عبدالرحمٰن بن عوف ہوں تو وہ آئیں اور نماز پوری کرائیں۔ ظالم فیروز خنجر گھماتا ہوا لوٹا اور اس نے تیرہ مسلمانوں کو اور زخمی کیا جن میں سے چھ شہید ہوئے۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے اسے پکڑا تو اس نے وہی خنجر اپنے سینہ میں مار کر خودکشی کر لی۔

نماز اسی حالت میں پوری کی گئی۔ پھر حضرت عمرؓ کو خون بہتے ہوئے گھر لایا گیا۔ آپ جب کچھ ہوش میں آئے تو لیٹے لیٹے نماز ادا کی۔ پھر پوچھا ان کا قاتل کون ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ مغیرہ بن شعبہ کا غلام فیروز مجوسی ہے۔ آپ نے فرمایا الحمدللہ کہ میری موت ایک کافر کے حملہ سے ہو رہی ہے، جس نے اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی سجدہ نہیں کیا۔

پھر آپ نے ایک شخص کو حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس بھیجا اور ان سے ان کے حجرہ میں اپنے محبوب رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن ہونے کی اجازت مانگی۔ انھوں نے کہا یہ جگہ میں نے اپنے لیے محفوظ کر رکھی تھی مگر میں آپ کو اپنی ذات پر ترجیح دیتی ہوں۔ آپ کو اس جواب کی اطلاع دی گئی تو فرمایا خدا کا شکر ہے کہ میری سب سے بڑی آرزو پوری ہوئی۔

آپ ۲۶ ذی الحجہ ۲۳ھ کو زخمی ہوئے تھے۔ تین روز بستر علالت پر رہ کر یکم محرم ۲۴ھ کو آغوشِ رحمتِ خداوندی میں سو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ آپ کی مدّتِ خلافت دس سال چھ مہینے چار روز ہوئی۔ وفات کے دوسرے روز تدفین عمل میں آئی۔

آپ نے اپنے صاحبزادہ عبداللہ بن عمرؓ کو وصیت کی کہ میرا قرضہ میرے متروکہ مال میں سے ادا کرنا۔ اگر اس سے پورا نہ ہو تو میرے اہلِ خاندان سے مانگ کر اسے پورا کرنا۔ اور اپنے جانشین کو وصیت کی کہ وہ مسلمانوں سے نیکی اور بھلائی کا سلوک کرے۔ شہادت سے ایک ماہ قبل جب آپ اپنے آخری حج سے فارغ ہوئے تو آپ نے بارگاہِ خداوندی میں گڑگڑا کر دعا کی تھی:

"اے اللہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں، میری قوت جاتی رہی ہے، اور رعیّت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، میں اُن کے حقوق ادا نہیں کر سکتا، تو مجھے اب اپنے پاس بلا لے اور مجھے اپنے مُقدّس نبی کے شہر مدینہ منورہ میں شہادت کی موت نصیب فرما۔"

بظاہر شہادت اور مدینہ منورہ میں رہ کر، غیر متوقع بات تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی۔ رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی رَحْمَۃً وَّاسِعَۃً کَامِلَۃً۔[1]

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۱۳۷

عہدِ خلافت کے کارناموں پر ایک نظر

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے، اُن لوگوں سے جو ایمان میں کمال رکھتے ہوں اور ان کی زندگیاں اعمالِ صالحہ سے مُزیّن ہوں، وعدہ فرمایا ہے کہ:

لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا۔

ان کو ضرور زمین کی خلافت عطا کرے گا جیسا کہ ان سے پہلوں کو خلافت دی تھی اور اس دین کو جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے ان کے ہاتھوں مضبوط کرے گا۔ اور کُفّار کا خوف ان سے دور کر کے ان کو امن و اطمینان عطا کرے گا۔

اس وعدہ کی تکمیل کا مصداق خُلفاءِ راشدین اور تمام صحیح العقیدہ اور نیک عمل والے مُسلم حکمراں ہیں۔ مگر حضرت فاروقِ اعظم کی خلافت اور ان کے دینی کارنامے اور مُلکی خدمات اس کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

یوں تو حضرت فاروق بہت سے انسانی و ایمانی کمالات سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ مگر عزم و ارادہ کی قُوّت، جُرأت و ہمّت اور شجاعت و بسالت آپ کے ایسے اوصاف تھے جن میں آپ مُنفرد اور یگانہ تھے۔

پہلے گذر چکا ہے کہ آپ کے اسلام میں داخل ہونے تک مسلمان دارِ ارقم بن ابی ارقم میں چھپ کر نمازیں جماعت کے ساتھ ادا کیا کرتے تھے۔ مگر آپ نے اسلام لاتے ہی اعلان کر دیا کہ اب ہم خانہ کعبہ میں کھُل کر نماز ادا کریں گے۔

عنانِ خلافت ہاتھ میں لیتے ہی آپ نے فیصلہ کر لیا کہ آپ مشرق و مغرب میں

اسلام کا جھنڈا بلند کریں گے، اور چپّہ چپّہ پر دینِ حق کا ڈنکا بجائیں گے۔
بے شک بُنیادیں حضرت صدیق اکبرؓ نے قائم کر دی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے ان بنیادوں پر خلافتِ اسلامی کا قصرِ رفیع تعمیر کر دیا۔

حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کی دس سال کی مدت میں ۲۲۵۱۰۳۰ مربع میل پر حکومتِ اسلامی کا جھنڈا لہرا دیا۔ اور شام، فلسطین، مصر، جزیرہ، عراق، خوزستان، آرمینیہ، فارس، آذربیجان، کرمان، خراسان، ترکستان اور مکران (جس میں بلوچستان شامل تھا) حکومتِ اسلامی کے زیرِ نگیں آ گئے۔

پھر دوسرے عظیم فاتحین کی طرح یہ فتوحات صرف خراج وصول کرنے کے لیے نہ تھیں، بلکہ اصل مقصد دینِ اسلام کی روشنی کو گھر گھر پہنچانا، اللہ سے بچھڑے ہوئے بندوں کو اللہ سے ملانا، ان کی گردنوں کو ظالموں اور ستم گروں کے پنجہ سے چھڑانا، ناانصافی، بددیانتی، بداخلاقی، بدکرداری، لوٹ کھسوٹ، دغا و فریب سے نجات دلانا اور مشرق و مغرب میں نیکیوں اور بھلائیوں کے گل بوٹے کھلانا تھا۔

اسلامی لشکر جو دشمنوں کے مقابلہ کے لیے جاتے، ان کو حکم تھا کہ بچوں، بوڑھوں عورتوں اور مذہبی لوگوں سے تعرّض نہ کریں۔ کسی جاندار کو آگ میں نہ جلائیں، کھیتوں اور باغوں کو نقصان نہ پہنچائیں، کسی کی ناک کان نہ کاٹیں، مفتوحین کے ساتھ بدعہدی اور فریب نہ کریں، فوج کے لیے سامانِ رسد بھی زبردستی نہ لیں۔

خیبر کے یہودیوں کو بغاوت اور سازش کے الزام میں جلاوطن کرنا پڑا تو اُن کی زمینوں کا معاوضہ دیا اور اضلاع کے حاکموں کو ہدایت کی گئی کہ یہ جس علاقہ میں قیام کریں، ایک سال تک ان سے جزیہ نہ لیا جائے۔

ملکِ شام میں جب ہرقل (شہنشاہِ روم) کی فوجوں کو مسلسل شکستیں ہوئیں تو اس نے معزز شامی عیسائیوں کو اپنے دربار میں بلایا اور پوچھا کہ عرب تم سے تعداد اور ساز و سامان میں کم ہیں۔ پھر بھی وہ تم پر غالب ہوتے چلے جا رہے ہیں، اس کی

وجہ کیا ہے؟ تو ایک بوڑھے سردار نے کہا:

"اے بادشاہ! ان کی اخلاقی خوبیوں کا ہم مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ میدانِ جنگ میں بھی خدا کی نافرمانی نہیں کرتے۔ رات کو نمازیں پڑھتے ہیں اور دن کو روزہ رکھتے ہیں۔ کسی پر ظلم نہیں کرتے۔ سب ایک دوسرے سے برابری کے ساتھ ملتے ہیں۔ ہمارا حال یہ ہے کہ شراب پیتے ہیں، بدکاری کرتے ہیں، بدعہدی کرتے ہیں اور ظلم کرنے سے نہیں بچتے۔"

تسخیرِ "اہواز" کے موقعہ پر، شاہِ اہواز ہرمزان نے صلح کرنے کے بعد بار بار عہد شکنی کی تو حضرت عمرؓ نے لشکرِ اسلام میں سے کچھ معزز اور معتبر لوگوں کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ ہرمزان کیوں بار بار عہد شکنی کرتا ہے، مسلمان حکام کی طرف سے مفتوحین کے حقوق ادا کرنے میں کمی تو نہیں ہو رہی ہے؟ احنف اور دوسرے ارکانِ وفد نے کہا: "امیر المومنین ہم تو ذمیوں کے ساتھ انصاف اور مہربانی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ شہنشاہ یزدگرد ان کو بھڑکاتا رہتا ہے۔" حضرت عمرؓ اس جواب سے مطمئن ہو گئے مگر پھر بھی بصرہ کے گورنر کو لکھا: "دیکھو اللہ سے ڈرتے رہو، ذمیوں کے معاملہ میں تم سے ناانصافی نہ ہو۔ تمہیں کامیابی اللہ تعالیٰ کی مدد سے ہوئی ہے۔ اللہ کی مدد اسی وقت تک تم کو ملے گی جب تک کہ تم اس کی مخلوق کے ساتھ ظلم اور ناانصافی نہ کرو گے۔"

فتوحاتِ مصر کے دوران قبطی بادشاہ مقوقس نے لشکرِ اسلام میں مصالحت کے لیے سفیر روانہ کیے۔ عمرو بن عاص سپہ سالارِ اسلام نے ان کو دو روز تک روکے رکھا تاکہ وہ مسلمانوں کے حالات اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ جب وہ واپس گئے تو مقوقس نے ان سے مسلمانوں کے حالات معلوم کیے۔ انھوں نے جواب دیا: "اے بادشاہ! مسلمان ایک ایسی قوم ہیں جنہیں موت زندگی سے زیادہ عزیز ہے، تواضع تکبر سے زیادہ پسند ہے۔ ان میں سے کوئی دنیا کا حریص نہیں۔ وہ زمین پر بیٹھنے میں عار نہیں سمجھتے۔ ان کا سردار، ان سے کسی بات میں امتیاز نہیں رکھتا۔ ان میں اعلیٰ و ادنیٰ اور

آقا و غلام کا فرق نہیں۔ جب نماز کا وقت آتا ہے تو سب وضو کر کے ایک قطار میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

مسلمانوں کے یہ اوصاف سُن کر مقوقس نے کہا: اے قوم! یہ جماعت اگر پہاڑوں سے بھی ٹکرائے گی تو انھیں اپنی جگہ سے ہلا دے گی۔ بہتر یہی ہے کہ ہم ان سے صلح کر لیں۔ چنانچہ مقوقس نے مسلمانوں سے صلح کر لی۔ اگرچہ رومی جو مصر پر فوجی اقتدار رکھتے تھے اس سے ناراض ہو گئے۔

یہی وجہ ہے کہ قبطیوں نے، مصر میں مسلمانوں کی پیش قدمی پر جا بجا ان کی مدد کی، راستے صاف کیے، دریا پر پُل بنائے اور فوج کے لیے رسد کا سامان کیا۔

اسی طرح فتوحاتِ شام میں، شامیوں نے خصوصاً یہودیوں نے مسلمانوں کے لیے خبر رسانی اور رسد رسانی کے انتظامات کیے۔

اگرچہ مفتوحہ علاقوں میں ہر شخص کو آزادی تھی کہ وہ جو مذہب چاہے اختیار کرے۔ مگر مسلمانوں کی اس پاکیزہ زندگی اور حُسنِ مُعاملت سے متاثر ہو کر مفتوحہ ملکوں میں اسلام نہایت تیزی سے پھیل گیا۔ اور اس طرح ان کے دلوں کو اپنی گرفت میں لیا کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں جو مُلک فتح ہوئے آج بھی وہ نیّرِ اسلام کی روشنی سے جگمگا رہے ہیں۔

مفتوحہ علاقوں میں دینی و تبلیغی ضروریات کی تکمیل کے بھی آپ نے ہر قسم کے انتظامات کیے۔ جو ملک فتح ہوتا آپ وہاں مساجد تعمیر کراتے۔ چنانچہ عراق میں، بصرہ اور کوفہ میں شاندار اور وسیع جامع مسجدیں تعمیر کی گئیں اور ہر ہر قبیلہ کے لیے الگ الگ مساجد تعمیر ہوئیں۔ اسی طرح مصر میں فسطاط میں اور شام میں بیت المقدس اور بیروت میں جامع عمر تعمیر ہوئیں، جو آج بھی ان کی لافانی یادگار ہیں۔ شام کے عُمّال کو لکھا کہ ہر ہر شہر میں ایک مسجد تعمیر کی جائے۔ بعض مورخین نے حضرت عمرؓ کی تعمیر کردہ مساجد کی تعداد چار ہزار لکھی ہے۔ (روضۃ الاحباب)

تمام مفتوحہ ممالک میں آپ نے مذہبی تعلیم کے لیے عُلما اور فُقہا اور واعظین

مقرر کیے۔ چنانچہ حضرت عبادہ بن صامت، معاذ بن جبل اور ابو درداء کو ملکِ شام میں اور حبان بن ابی جبلہ کو مصر میں، اور عبداللہ بن مغفل اور عمران بن حصین کو بصرہ میں حدیث و فقہ کی تعلیم کے لیے مقرر فرمایا اور ان کی تنخواہیں بھی مقرر کیں تاکہ اطمینان اور فراغت کے ساتھ تعلیم و تبلیغ کی خدمات انجام دیں۔

حضرت عمر فاروق اپنے آپ کو بادشاہ نہیں بلکہ مخلوقِ خدا کا خادم سمجھتے تھے۔ رعایا کے آرام و آسائش کا خیال ان کو بے چین رکھتا تھا۔ دور دراز علاقوں میں انھوں نے مخبر اور پرچہ نویس مقرر کر رکھے تھے۔ اور اپنے عُمّال کی کارکردگی کی پوری خبر رکھتے تھے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص کے متعلق معلوم ہوا کہ انھوں نے کوفہ میں ایک محل اپنے لیے بنوایا ہے جس میں ڈیوڑھی بھی ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ اہلِ حاجت کو گورنر سے ملنے میں دِقت ہوگی۔ اور محمد بن مسلمہ کو حکم دیا کہ کوفہ جائیں اور ڈیوڑھی میں جاکر آگ لگا دیں۔ اِس حکم کی فوراً تعمیل کی گئی اور سعد بن ابی وقاص دَم نہ مار سکے۔

عیاض بن غنم مصر کے عامل تھے، ان کے متعلق خبر پہنچائی گئی کہ وہ باریک کپڑا پہنتے ہیں اور ان کے دروازہ پر دربان ہے۔ محمد بن مسلمہ کو حکم ہوا کہ مصر جائیں، اور اگر یہ اطلاع درست ہے تو عیاض کو ساتھ لے کر آئیں۔ حکم کی فوراً تعمیل ہوئی۔ عیاض واقعی باریک کپڑے پہنے ہوئے تھے اور دروازہ پر دربان بھی تھا۔ ان کو خلیفہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ باریک کپڑے اُتروا کر کمبل کے کپڑے پہنوائے گئے اور بکریوں کا ایک گلّہ دے کر انھیں چرانے کا حکم دیا۔ اور فرمایا کہ تجھے اس سے عار کیوں ہے، آخر تیرا باپ بھی تو بکریاں چراتا تھا۔

مدینہ منورہ میں خود مخلوقِ خدا کے حالات سے واقفیت اور ان کی حاجت روائی اور آرام رسانی کے لیے راتوں کو تنِ تنہا چکّر لگاتے تھے۔ اور کسی کو تکلیف میں پاتے تو فوراً اسے دور کرتے تھے۔

ایک روز گشت کرتے ہوئے مدینہ کے باہر مقامِ حرا پہنچے۔ دیکھا کہ ایک جھونپڑی

کے سامنے ایک عورت نے چولھے پر ایک ہانڈی چڑھا رکھی ہے اور تین چھوٹے بچے رو رہے ہیں۔ پوچھ گچھ کی تو عورت نے بتایا کہ گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ بچے بھوک سے بے قرار ہو کر رو رہے ہیں۔ اور اس نے ان کے بہلانے کو خالی ہانڈی چولھے پر چڑھا رکھی ہے۔ فوراً مدینہ واپس آئے اور کھانے کا سامان آٹا گھی کھجوریں وغیرہ لاد کر لے چلے۔ آپ کے غلام اسلم نے کہا یہ سامان مجھے دیجیے میں پہنچا دُں گا۔ آپ نے جواب دیا قیامت کے دن تم میرا بوجھ نہیں اٹھاؤ گے۔ خود لے جا کر یہ سامان اس عورت کو دیا اور اس نے کھانا پکا کر بچوں کے سامنے رکھا تو بچے خوشی سے اُچھلنے لگے، حضرت عمرؓ ان کو دیکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔

ایک دن اور اسی طرح گشت کر رہے تھے کہ ایک بدّو کے خیمہ سے رونے کی آواز آئی۔ معلوم ہوا کہ اس کی بیوی کے بچہ پیدا ہونے والا ہے اور وہ تنہا ہے۔ حضرت عمرؓ واپس اپنے گھر آئے اور اپنی بیوی اُمِّ کلثوم کو ساتھ لیکر بدّو کے خیمہ میں پہنچے۔ تھوڑی دیر بعد بچہ پیدا ہوا۔ ام کلثوم نے پکار کر کہا: امیر المومنین اپنے دوست کو مبارکباد دیجیے، بچہ پیدا ہوا ہے۔ بدّو امیر المومنین کا لفظ سنکر گھبرا گیا۔ آپ نے اسے تسلی دی اور کہا کل میرے پاس آنا۔ میں بچہ کا وظیفہ مقرر کر دوں گا۔

اس قسم کے بہت سے واقعات حضرت عمرؓ کے حالات میں مذکور ہیں۔

آپ کا معمول تھا کہ مجاہدین کے گھروں کا چکر لگاتے۔ عورتوں کو بازار سے سودا سلف منگانا ہوتا تو لا دیتے۔ میدانِ جنگ سے ان کے نام خطوط آتے تو خود گھر گھر جا کر انھیں پہنچاتے اور ان کو جواب بھجوانے ہوتے تو خود ان کو لکھ دیتے۔

نابینا اور بیمار اور معذور لوگوں کے گھروں پر جا کر ان کے کام کر دیتے۔ خود ان کی اپنی اور ان کے اہل و عیال کی زندگی نہایت سادہ اور غریبانہ تھی۔ عام طور پر روٹی اور چکنائی یا روغنِ زیتون پر گزارہ تھا۔ گوشت اور دودھ کبھی کبھی ہوتا، لباس نہایت معمولی اور اکثر پیوند لگا ہوا ہوتا۔ سونے کے لیے فرشِ زمین پر بلا تکلف لیٹ جاتے۔ چنانچہ جب ہرمزان شاہِ اہواز دربارِ خلافت میں حاضر ہوا تو آپ مسجدِ نبوی کے صحن میں سنگریزوں کے فرش پر آرام فرما رہے تھے۔ وہ خلیفۂ اسلام کو اس حال میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

پہلے تجارت ذریعۂ معاش تھا۔ جب خلافت کی ذمہ داری کاندھوں پر پڑی تو اس کے لیے فرصت نہ رہی۔ پانچ ہزار درم سالانہ جو تمام بدری صحابہ کا وظیفہ تھا، ان کا بھی وظیفہ مقرر ہوا۔ اسی میں اس بڑے خاندان کی عسرت کے ساتھ گزر بسر ہوئی۔ وفات کے وقت کافی قرضہ چھوڑا جو مکانِ مسکونہ بیچ کر ادا کیا گیا۔

خاندانِ عمر فاروقؓ

حضرت عمر فاروقؓ نے مختلف اوقات میں کئی نکاح کیے اور ان سے متعدد اولاد پیدا ہوئی۔ تفصیل یہ ہے:

(۱) زینب بنت مظعون، عثمان بن مظعون کی بہن۔ ان سے عبداللہ اور عبدالرحمٰن اکبر پیدا ہوئے۔ اور حضرت حفصہ، زوجۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی انھیں سے پیدا ہوئیں۔

(۲) ملیکہ بنت جرول۔ ان سے عبیداللہ پیدا ہوئے۔ ان کو طلاق دے دی تھی۔

(۳) اُمِّ حکیم بنت حارث۔ ان سے فاطمہ پیدا ہوئیں۔ ان کو بھی طلاق دے دی تھی۔

(۴) جمیلہ بنت عاصم بن ثابت۔ بکر ← اسد الغابۃ 3/380

(۵) عاتکہ بنت زید۔ پہلے عبداللہ بن ابی بکرؓ کی زوجیت میں تھیں۔

(۶) اُمِّ کلثوم بنت علی بن ابی طالب۔ خاندانِ نبوت سے تعلق پیدا کرنے کے لیے یہ نکاح کیا اور اسی لیے ۴۰ ہزار درہم ان کا مہر منظور کیا۔ زید اور رقیہ ان سے پیدا ہوئے۔

(۷) قریبہ بنت ابی امیہ۔

ان کے علاوہ دو باندیاں بھی تھیں، فکیہہ اور لہیہ۔ ان سے بھی اولاد ہوئی۔

حضرت عمر کی کل اولاد یہ تھی۔ لڑکے: زید اکبر، زید اصغر، عاصم، عبداللہ، عبدالرحمٰن اکبر، عبدالرحمٰن اوسط، عبدالرحمٰن اصغر، عبیداللہ، عیاض۔

لڑکیاں: حفصہ، رقیہ، زینب، فاطمہ۔[۱]

---

[۱] البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۱۳۹۔

عہدِ خلافتِ عثمانی

انتخابِ خلافت

جب حضرت عمر فاروقؓ کے دُنیا سے رخصت ہونے کا وقت قریب آیا، تو صحابہ کی ایک جماعت نے آپ سے درخواست کی کہ اپنے بعد کسی کو خلیفہ نامزد فرمادیں تاکہ مسلمانوں میں اختلاف نہ ہو۔

آپ نے فرمایا، اگر میں ایسا کروں تو اس میں کچھ حرج نہیں، کیونکہ حضرت ابوبکرؓ نے ایسا کیا۔ اور اگر ایسا نہ کروں تو اس میں بھی حرج نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی کیا۔

پھر فرمایا، اگر ابوعبیدہ بن الجراح آج زندہ ہوتے تو میں ان کو خلیفہ نامزد کر دیتا۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ ابوعبیدہ اس اُمّت کے امین ہیں۔ اور اگر سالم، ابوحذیفہ کے غلام زندہ ہوتے تو یہ ذمہ داری ان کے سپرد کر دیتا۔ کیونکہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ سالم عشقِ خداوندی کا پروانہ ہیں۔ کسی نے کہا: آپ کے فرزند عبداللہ بن عمر تو موجود ہیں، وہ کسی سے کم نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے خلافت کو اپنے لیے ہی کب پسند کیا کہ اب اپنے خاندان کے کسی فرد کے لیے پسند کروں۔ خاندانِ عمر میں سے ایک ہی شخص اس ذمہ داری کے محاسبے کے لیے کافی ہے۔ اگر قیامت کے دن میں اس کے محاسبے برابر سرابر بھی چھوٹ جاؤں تو اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھوں۔

صحابہ اس وقت تو خاموش ہو گئے۔ پھر کسی دوسرے وقت موقعہ دیکھ کر اس بات کو چھیڑا۔

آپ نے فرمایا: یہ چھ صاحبان ہیں، جن کے جنتی ہونے کی بشارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے: علی، عثمان، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، زبیر بن عوام، اور طلحہ بن عبیداللہ۔ میں یہ اہم ذمہ داری ان کے سپرد کرتا ہوں اور اختیار دیتا ہوں کہ وہ میرے دنیا سے رُخصت ہونے کے بعد تین دن کے اندر اندر مشورہ کرکے اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ انتخاب کرلیں۔ میرے فرزند عبداللہ بن عمر کو بھی مشورہ میں شریک کرلیں مگر خلافت کے لیے ان کو انتخاب نہ کیا جائے۔ اور اگر اختلافِ رائے ہو تو فیصلہ کثرتِ رائے سے ہوگا۔ اگر تین ایک طرف اور تین دوسری طرف ہوں تو عبداللہ بن عمر کو فیصلہ کُن رائے دینے کا حق ہوگا۔ لیکن اگر یہ منظور نہ ہو تو جس طرف عبدالرحمٰن ہوں وہ رائے مانی جائے گی۔

میری نمازِ جنازہ صُہیب بن سِنان رُومی پڑھائیں۔ اور جب تک نیا خلیفہ منتخب ہو پانچ وقت کی نمازیں بھی مسجدِ نبوی میں وہی پڑھائیں۔ مقداد بن اسود اور ابوطلحہ انصاری اس شوریٰ کے منتظم ہوں گے۔

حضرت عمر کی تدفین کے بعد، مقداد بن اسود نے ان صاحبان کو ایک جگہ جمع کیا۔ کچھ دیر گفتگو کے بعد ان چھ صاحبوں میں سے تین نے اپنی ذمہ داری دوسروں کے سپرد کردی۔ زبیر بن عوام نے حضرت علی کو، سعد بن ابی وقاص نے عبدالرحمٰن بن عوف کو، طلحہ نے حضرت عثمان کو، اس طرح حقِ انتخاب صرف تین صاحبان علی، عثمان، اور عبدالرحمٰن بن عوف کو رہ گیا۔

اب حضرت عبدالرحمٰن نے حضرت علی کو اور حضرت عثمان کو مخاطب کرکے کہا: ہم میں سے جو شخص اپنے حق سے دست بردار ہو جائے، اُسے بقیہ دو میں سے کسی ایک کو انتخاب کا حق دے دیا جائے۔ کون صاحب اس کے لیے تیار ہیں؟ جب ان میں سے کوئی تیار نہ ہوا تو حضرت عبدالرحمٰن نے کہا: میں اس کے لیے تیار ہوں۔ اس طرح دونوں ساتھیوں کی منظوری سے انتخابِ خلیفہ کی ذمہ داری حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے کاندھوں پر آپڑی۔

مگر حضرت عبدالرحمٰن نے اس اہم ذمہ داری کو تنہا اپنے سر لینا مناسب نہ سمجھا۔ حضرت عمر کی وفات کی وجہ سے بلادِ اسلامی کے مختلف گوشوں سے اُمراء، عُمّال اور سردارانِ قبائل مدینہ منورہ آئے ہوئے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن رات کی اندھیری میں چادر مُنہ پر ڈال کر ایک ایک سے پوچھتے، حتیٰ کہ پردہ نشین عورتوں سے بھی کہ علی اور عثمان دو بزرگوں میں سے کون ان کے نزدیک خلافت کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ ساری ساری رات چکّر لگاتے رہتے۔ بس نماز، دعا اور اس کام کے سوا وہ کوئی کام نہ کرتے۔ معلوم ہوا کہ بہت بڑی اکثریت حضرت عثمان کو ترجیح دیتی ہے۔

تین روز و شب مشورہ میں گزارنے کے بعد حضرت عبدالرحمٰن نمازِ عصر کے وقت مسجدِ نبوی میں اپنے فیصلہ کے اعلان کے لیے تشریف لائے۔ مسجد اس فیصلہ کو سننے کے لیے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ آپ نے فرمایا: "مسلمانو! میں نے کھلم کھلا اور تنہائی میں خلافت کے مسئلہ میں مسلمانوں کی رائے لی۔ کسی نے علی اور عثمان کے علاوہ کسی اور کو اس اہم منصب کا اہل نہ سمجھا۔" پھر حضرت عبدالرحمٰن نے حضرت علی کو بُلایا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا: اے علی! کیا تم کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور طریقۂ ابوبکر و عمر پر عمل کی شرط پر خلافت کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار ہو؟ حضرت علی نے فرمایا میں وعدہ نہیں کر سکتا، تاہم اپنی سی کوشش کروں گا۔ پھر انھوں نے حضرت علی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور حضرت عثمان کو بلایا اور اُن کا ہاتھ پکڑ کر یہی کلمات اُن سے دُہرائے۔ حضرت عثمان نے کہا، ہاں ضرور۔ اُس کے بعد حضرت عبدالرحمٰن نے بآوازِ بلند کہا:

"اے اللہ تو سُن لے اور گواہ رہ، جو ذمہ داری میرے سپرد کی گئی تھی میں نے اسے اپنے کاندھوں سے اُتار کر عثمان کے کاندھوں پر ڈال دیا ہے۔"

یہ سنتے ہی مسلمانوں کا ہجوم حضرت عثمان سے بیعت کرنے کے لیے ان پر ٹوٹ پڑا۔ حضرت علی نے بھی بے تامل حضرت عثمان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

یہ واقعہ ۳ محرم ۲۴ھ کا ہے۔[1]

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۷، ۱۴۵/ ۱۴۷ مطبوعہ مصر۔ حضرت علی کا جواب یہ لکھا ہے "لا ولکن علیٰ جھدی من ذٰلک وطاقتی"

حالاتِ قبلِ خلافت

عثمان نام، ابوعمرو کنیت، والد کا نام عفّان، ماں کا نام اروی۔ سلسلۂ نسب یہ ہے: عثمان بن عفان بن ابی العاص بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف بن قصی۔ قریش کے ایک معزز خاندان بنی امیہ سے تھے۔ آپ کے پردادا امیہ قریش کے نامور سرداروں میں سے تھے۔ قریش کا قومی جھنڈا اسی خاندان کے پاس رہتا تھا۔ قریش کی قومی لڑائیوں میں اکثر اسی خاندان کے افراد سپہ سالار کا فرض انجام دیتے تھے۔

حضرت عثمان واقعۂ فیل کے چھٹے سال پیدا ہوئے۔ عرب کے رواج کے خلاف پڑھنا لکھنا سیکھا۔ جوان ہوئے تو تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ اور اپنی دیانت و امانت و صداقت و محنت کی وجہ سے بڑی کامیابی حاصل کی۔ بڑے نیک، پاکباز، دریا دل اور باحیا تھے۔ اسلام سے پہلے بھی کبھی نہ بُت پرستی کی، نہ شراب پی۔ حضرت صدیقِ اکبر سے دوستی تھی۔ انہی کی ترغیب سے شروع ہی میں اسلام لائے۔ اور ساری عمر پیغمبرِ اسلام کی رفاقت اور مسلمانوں کی خدمت میں صرف کردی۔

قبولِ اسلام کے بعد ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دامادی کا شرف حاصل ہوا حضور نے اپنی منجھلی صاحبزادی حضرت رُقیہؓ کی شادی ان سے کردی۔

آغازِ اسلام میں مسلمان کافروں کے ہاتھوں طرح طرح کے ظلم سہتے، ان کا خاندان اس ستم رسانی میں سب سے آگے تھا۔ آپ بھی ان کے مظالم کا نشانہ بنے۔ آپ کا چچا حکم بن عاص آپ کو رسّیوں سے جکڑ کر مارتا اور آپ کو ترکِ اسلام پر مجبور کرتا۔

سنہ نبوی میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مظلوم مسلمانوں کو حبش کی طرف ہجرت کی اجازت دی تو آپ بھی پہلے قافلہ میں اپنی زوجۂ محترمہ کو ساتھ لے کر ہجرت فرما گئے۔ حضور نے ارشاد فرمایا:

"عثمان پہلے شخص ہیں میری امت میں جنھوں نے اپنے گھر والوں کے ساتھ ہجرت کی ہے"

چند سال کے بعد قریش کے اسلام کی غلط خبریں سن کر آپ واپس آئے۔ مگر یہاں کافروں کے مظالم کا سلسلہ جاری تھا۔ جب جماعتی حیثیت سے مدینہ منورہ کو مرکزِ اسلام بنانے کا فیصلہ ہوا تو آپ بھی اپنے اہل و عیال کے ساتھ مدینہ منورہ ہجرت کر گئے۔

یہاں اطمینان نصیب ہوا تو پھر تجارت میں لگ گئے۔ اور اپنی دولت و ثروت سے اسلام کو بہت قوت پہنچائی اور مسلمانوں کی نصرت و خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ آپ کی دریا دلی اور داد و دہش کی وجہ سے "غنی" آپ کا لقب ہو گیا۔

مدینہ منورہ آنے کے بعد مسلمانوں کو پانی کی تکلیف بہت تھی۔ یہاں صرف ایک میٹھا کنواں تھا جس کا نام رومہ تھا۔ اس کا مالک ایک یہودی تھا جو اس کا پانی گراں قیمت پر بیچتا تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو اس کنویں کو خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دے اسے جنت ملے گی۔ حضرت عثمان نے بیس ہزار درہم میں خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔

شروع میں مسجدِ نبوی بہت چھوٹی تھی۔ زمین کا ایک ٹکڑا اس کے قریب بکنے لگا۔ حضورؐ نے فرمایا جو شخص اسے خرید کر مسجد میں شامل کر دے گا اسے جنت ملے گی۔ حضرت عثمان نے اسے پچیس ہزار درہم میں خرید کر وقف کر دیا۔

غزوۂ تبوک کے موقعہ پر مسلمان بہت تنگ حال تھے۔ اُدھر مقابلہ رومی حکومت سے تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے چندہ کی اپیل کی۔

حضرت عثمان بھلا اس موقعہ پر چوکنے والے تھے! آپ نے دس ہزار مجاہدین کا خرچ اپنے ذمہ لیا۔ اس کے علاوہ ایک ہزار اونٹ، ستر گھوڑے اور ایک ہزار دینار نقد حضور کی خدمت میں پیش کیے۔ آپ ان کی اس فیاضی سے خوش ہو کر اشرفیوں کو اُچھالتے جاتے تھے اور فرماتے تھے:

"آج کے دن کے بعد، عثمان کا کوئی عمل ان کو نقصان نہ پہنچائے گا۔"

اپنے دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ ان کا سلوک اور بھی بہتر ہوتا۔ ایک دن

حضرت عثمان مسجد میں جا رہے تھے۔ حضرت طلحہ نے ان کو روک کر کہا: آپ کے پچاس ہزار جو میرے ذمہ ہیں، میں نے ان کا انتظام کر لیا ہے، انھیں لے لیجیے۔ حضرت عثمان نے کہا تمہاری شرافت کی وجہ سے وہ میں نے تمہیں ہبہ کیے۔ تم انھیں اپنے ہی پاس رکھو۔

عام الرمادہ کے قحط میں آپ نے غلّہ کے ایک ہزار اونٹ پیش کیے۔ ان عطیّات و خیرات کے علاوہ دوسرے دینی کاموں میں بھی آپ پیش پیش تھے۔ تمام غزوات میں آپ نے شرکت کی۔ البتہ بدر میں آپ شریک نہ ہو سکے۔ کیونکہ صاحبزادیِ رسول اللہ اور آپ کی چہیتی بیوی حضرت رُقیہ بہت بیمار تھیں۔ حضور نے فرمایا اے عثمان! تم رقیہ کی تیمارداری کرو۔ تم کو مدینہ میں ہی رہ کر جہاد کا ثواب ملے گا۔

حضرت رقیہ کا اسی بیماری میں انتقال ہو گیا۔ حضرت عثمان کو اس محرومی کا بڑا غم تھا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دوسری صاحبزادی اُمِّ کلثوم سے ان کا نکاح کر دیا۔ بدر کے مالِ غنیمت میں سے بھی ان کو حصہ دیا۔ اسی لیے آپ ذو النورین (دو نوروں والے) کہلائے۔ حُدیبیہ کے موقعہ پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اپنا سفیر بنا کر مکہ والوں کے پاس بھیجا۔ ان کو واپس آنے میں دیر ہوئی تو مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ وہ شہید کر دیے گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر مسلمانوں سے موت کی بیعت لی۔ اور اپنے ایک ہاتھ پر دوسرا ہاتھ مار کر حضرت عثمان کی طرف سے خود بیعت کی۔ گویا اپنے ہاتھ کو عثمان کا ہاتھ قرار دیا۔ یہ حضرت عثمان کا قابلِ رشک امتیاز ہے۔

چونکہ پڑھے لکھے تھے اس لیے کتابتِ وحی کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی خطوط بھی لکھتے تھے۔ یہ حضور کے اُن پر مکمل اعتماد کی علامت تھی۔

بڑے حسین و جمیل اور فہیم و عقیل تھے۔ حضرت ابو بکر و حضرت عمر کے خصوصی مُشیر تھے۔ یہ دونوں اہم مُلکی و دینی معاملات میں آپ سے مشورہ کرتے تھے۔

واقعاتِ عہدِ خلافت

پہلا مقدمہ

عام طور پر یہ بات مشہور تھی کہ حضرت فاروقِ اعظم کی شہادت ایک سازش کا نتیجہ تھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر نے بتایا کہ جس روز صبح کو یہ واقعہ پیش آیا، اُس کی رات کو انھوں نے ایک جگہ دیکھا کہ ابو لولوہ فیروز، جفینہ نصرانی اور ہرمزان پارسی آپس میں کانا پھوسی کر رہے ہیں۔ جیسے ہی وہ ان کے قریب پہنچے، گھبرا کر وہ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ اسی گھبراہٹ میں کسی ایک کے کپڑوں میں سے ایک خنجر نکل کر زمین پر گرا۔ اس کے دونوں طرف دھار تھی اور درمیان میں دستہ۔

حضرت فاروقؓ کے صاحبزادہ عبیداللہ بن عمرؓ نے وہ خنجر منگا کر دیکھا جو اُن کے والد بزرگوار کی شہادت کے بعد ابو لولوہ کے پاس سے نکلا تھا، تو وہ ہو بہو ایسا ہی تھا۔ آپ غم اور غصّہ میں بے قابو ہو کر نکلے اور ابو لولوہ کی بیٹی اور ہرمزان کو قتل کر دیا۔ حضرت صُہیبؓ نے جو قائم مقام خلیفہ تھے، عبیداللہ کی گرفتاری کا حکم دیا اور فرمایا یہ معاملہ ہونے والے خلیفہ کے سامنے پیش کیا جائے۔

چنانچہ، خلافت کی ذمہ داری سنبھالتے ہی ان کے سامنے پہلا مقدمہ یہی پیش ہوا۔ انھوں نے اکابر صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا، انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ عبیداللہ کو قصاص میں قتل کیا جائے۔ مہاجرین میں سے کچھ لوگوں نے کہا، خوب، کل تو باپ شہید ہوئے آج بیٹے کو قتل کر دیا جائے! یہ نہیں ہو سکتا۔ عمرو بن عاصؓ نے کہا یہ معاملہ آپ کے عہدِ خلافت سے پہلے کا ہے، آپ اس کے ذمہ دار نہیں۔

حضرت عثمانؓ نے اپنے پاس سے مقتولین کی دِیَت ادا کی، چونکہ ان کا کوئی وارث نہ تھا اس لیے رقم بیت المال میں داخل کی گئی۔ اس طرح یہ معاملہ بہ حسن و خوبی تمام ہوا۔

عُمّالِ عہدِ عثمانی

حضرت عثمان نے عنانِ خلافت ہاتھ میں لی تو وسیع حکومتِ اسلامی کے مختلف صوبوں میں اُمراء و حُکّام کی تفصیل یہ تھی:

(۱) مکہ معظمہ و اطراف	نافع بن حارث خزاعی
(۲) طائف	سفیان بن عبداللہ ثقفی
(۳) صنعاء	یعلی بن منیہ
(۴) جند	عبداللہ بن ابی ربیعہ
(۵) بحرین و مضافات	عثمان بن ابی العاص ثقفی
(۶) کوفہ "	مغیرہ بن شعبہ ثقفی
(۷) بصرہ "	ابو موسیٰ اشعری
(۸) دمشق	معاویہ بن ابی سفیان اُموی
(۹) حمص (شام)	عمیر بن سعد
(۱۰) مصر	عمرو بن عاص

یہ اُمراء حضرت عمر کے مقرر کردہ تھے۔ حضرت عثمان نے ایک سال تک ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ البتہ کوفہ میں مغیرہ بن شعبہ کی جگہ سعد بن ابی وقاص کو والی بنایا۔ کیونکہ حضرت عمر نے یہ وصیّت کی تھی۔

گورنروں کو ہدایت نامہ

آپ نے تمام اُمراء و حُکّام کے نام یہ ہدایت نامہ ارسال کیا:

"امّا بعد، اللہ تعالیٰ نے حُکّام کو حکم دیا ہے کہ وہ رعیت کے نگہبان اور محافظ بنیں۔ ان سے یہ نہیں کہا کہ وہ محصول وصول کرنے والے بنیں۔ اب تک یہی ہوتا رہا ہے۔ مگر اندیشہ ہے کہ اب معاملہ برعکس ہو جائے اور حکام، محافظ رعیت بننے کی بجائے ٹیکس وصول کرنے والے بن جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو حیا، امانت اور وفا جیسی خصائلِ حمیدہ مفقود ہو جائیں گی۔

سُن لو! منصفانہ طرزِ عمل یہ ہے کہ مسلمانوں کے معاملات پر نگاہ رکھو، جو اُن کے حقوق ہیں وہ ان کو دو۔ اور جو ان کے فرائض ہیں وہ ان سے پورے کراؤ۔ اسی طرح ذمیوں کے معاملات پر نظر رکھو۔ ان کے بھی جو حقوق ہیں وہ ان کو ادا کرو۔ اور جو ذمہ داریاں ان کی ہیں وہ ان سے پوری کراؤ۔ جن دشمنوں پر تم بار بار حملے کرتے ہو ان سے بھی جو وعدے کرو انہیں پورا کرو۔"[1]

---

[1] محاضرات خضری ج ۲ ص ۴۰

فتوحاتِ عہدِ عثمانی

آذربیجان اور رَے کے سرحدی ممالک "کوفہ" سے متعلق تھے۔ ان کی نگرانی اور انتظام والیِ کوفہ کی ذمہ داری تھی۔ کوفہ میں چالیس ہزار سپاہی مستقل طور پر رہتے تھے۔ ہر سال اُن میں سے دس ہزار ان علاقوں کی مُہمّات کے لیے بھیجے جاتے۔ چھ ہزار آذربیجان میں اور چار ہزار رے میں۔ یوں ہر چوتھے سال ایک سپاہی کو میدانِ جنگ میں جانا پڑتا تھا۔ مفتوحہ علاقوں کی فوجی نگرانی، وہاں اگر بغاوت ہو تو اسے فرو کرنا، اور اگر ضرورت ہو تو آگے پیش قدمی کرنا، اُن کے فرائض میں داخل تھے۔

آذربیجان کی دوبارہ فتح ولید بن عقبہ کی امارت کے زمانہ میں ۲۶ھ میں آذربیجان میں بغاوت ہوئی۔ وہاں کے سرداروں نے جزیہ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ ولید نے فوج کشی کر کے ان کو پھر مُطیع بنایا۔ انھوں نے سابقہ عہد کے مطابق مَحاصل ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ اسی زمانہ میں معلوم ہوا کہ آرمینیہ والے بھی شورش پر آمادہ ہیں۔ سلیمان بن ربیعہ باہلی کو اُدھر روانہ کیا گیا۔ انھوں نے وہاں امن و امان قائم کیا اور مُفسدین کی سرکوبی کی۔ سعید بن عاص کی امارت کے زمانہ میں طبرستان کو فتح کیا گیا۔ یہ علاقہ بحرِ خزر کے کنارے واقع تھا۔ جو زبردست لشکر اسے فتح کرنے کے لیے بھیجا گیا اس میں حضرت حسن و حضرت حسین، حضرت عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمرو بن عاص اور عبداللہ بن زبیر بن عوام جیسے اکابر شریک تھے۔

اسی زمانہ میں شاہِ جُرجان نے سعید بن عاص سے مجبور ہو کر صلح کی درخواست کی۔ اور دو لاکھ درہم سالانہ بطورِ خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا۔

بلنجر کی فتح ۳۲ھ میں عبدالرحمٰن بن ربیعہ باہلی بلادِ خزر میں (جو دربند

(باب الابواب) کے اس پار ترکوں کا علاقہ ہے) گھس گئے۔ یہاں تک کہ وہاں کے مرکزی شہر بلنجر پہنچ گئے۔ یہاں ترکوں نے بہت بڑی جمعیت کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا۔ مسلمانوں کو یہاں ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا، اور عبدالرحمٰن اس معرکہ میں شہید ہوئے۔ ان کے بعد ان کے بھائی سلمان کو اس علاقہ کی ذمہ داری سپرد کی گئی۔ وہ لشکرِ اسلام کو حفاظت کے ساتھ نکال لائے۔

ولایتِ بصرہ سے متعلق فارس، خراسان اور سندھ کے علاقے تھے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری کے بعد عبداللہ بن عامر جس زمانہ میں وہاں کے امیر تھے، اہلِ فارس نے بغاوت کی۔ اور وہاں کے والی عبیداللہ بن معمر کو شہید کر دیا۔ ابن عامر نے ان پر فوج کشی کی اور ان کو سخت سزا دی۔

خراسان وغیرہ کی دوبارہ فتح

۳۱ھ میں اہلِ خراسان نے عہد شکنی کی۔ ابن عامر ایک بڑا لشکر لے کر ان کی گوشمالی کے لیے نکلے۔ جب وہ طبسین کے مقام پر پہنچے تو اہلِ خراسان نے صلح کا پیغام بھیجا جسے انھوں نے منظور کیا۔ پھر وہ قہستان کی طرف بڑھے اور وہاں کے باشندوں سے جنگ کی۔ آخر انھوں نے بھی ہتھیار ڈال دیے اور صلح کر لی۔ پھر وہ نیشاپور کی طرف بڑھے۔ وہاں کے حاکم نے بھی صلح کی درخواست کی۔

پھر انھوں نے احنف بن قیس کو طخارستان (نہر جیحون کے قریب ایک علاقہ ہے) کی طرف بھیجا۔ انھوں نے اسے فتح کیا۔ پھر احنف مرورود کی طرف بڑھے۔ وہاں ان کا مقابلہ دشمن کی فوجِ کثیر سے ہوا جسے انھوں نے شکست دی، اور اس علاقہ پر حکومتِ اسلامی کا علم لہرایا۔ پھر وہ بلخ کی طرف بڑھے، وہاں کے لوگوں نے صلح کر لی پھر خوارزم پہنچے۔ مگر اسے فتح کرنے میں دشواریاں پیش آئیں، اور انھیں لوٹنا پڑا۔ ان فتوحات کے بعد ابن عامر اپنے صدر مقام بصرہ کی طرف واپس آ گئے۔[1]

---

[1] محاضراتِ خضری ص ۴۳/۲

فتوحاتِ شام

شام کا پورا صوبہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان کی امارت میں تھا۔ ان کی رومیوں سے چھیڑ چھاڑ ہوتی رہتی تھی۔ انھوں نے عموریہ پر قبضہ کر لیا۔ دمشق اور عموریہ کے درمیان جو قلعے تھے اُن میں انھوں نے مجاہدین کو بسایا اور انھیں مضبوط چھاؤنیوں میں بدل دیا۔ حضرت عثمان کے حکم سے حبیب بن مسلمہ کو آرمینیہ کی طرف روانہ کیا، وہ قالیقلا پہنچے۔ پھر فتوحات کرتے ہوئے تفلس تک پہنچ گئے۔

فتحِ قبرص

قبرص (سائیرس) شام کے قریب بحرِ روم میں ایک زرخیز جزیرہ ہے۔ اس کی حیثیت شام اور روم کے درمیان پُل کی ہے۔ حضرت معاویہ عہدِ فاروقی ہی میں اس پر فوج کشی کرنا چاہتے تھے مگر حضرت عمر بحری لڑائیوں کے خلاف تھے، انھوں نے اجازت نہ دی۔ حضرت عثمان کے زمانہ میں انھوں نے پھر قبرص پر حملہ آور ہونے کی اجازت طلب کی اور حضرت عثمان کو لکھا کہ شام و مصر کو رومیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے قبرص کی فتح ضروری ہے۔ انھوں نے اجازت دے دی مگر یہ ہدایت کی کہ اس مہم میں اُنھی مجاہدین کو بھیجا جائے جو اپنی خوشی سے جانا چاہیں۔ پھر ۲۸ھ میں ایک بہت بڑا بحری بیڑہ روانہ کیا جو سمندر کی موجوں کو پھاڑتا ہوا بعافیت قبرص پر لنگر انداز ہوا۔ اس میں متعدد صحابۂ کرام شریک ہوئے، جن میں حضرت عبادہ بن صامت اور ان کی بیوی اُمِّ حرام بھی تھیں۔ والیِ مصر عبداللہ بن ابی سرح بھی اس کی مدد کے لیے اپنا بیڑہ لے کر پہنچے۔ اہلِ قبرص مقابلہ کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے اِن شرائط پر صلح کر لی: اہلِ قبرص سات ہزار دینار سالانہ خراج ادا کریں گے۔ رومیوں کی نقل و حرکت سے مسلمانوں کو باخبر رکھیں گے۔ مسلمانوں پر ان کی مدد ضروری نہ ہوگی۔ اسلامی فوج اگر یہاں سے گزرنا چاہے گی تو وہ منع نہ کریں گے۔

جنگی بیڑہ

حضرت معاویہ نے بحری جنگوں کے لیے، شام میں جہازوں کی

تیاری کا کارخانہ قائم کیا تھا۔ شانیہ اور صائفہ کے نام سے بحری لڑائیوں کے لیے دو بحری لشکر بنائے تھے۔ ایک جاڑوں کے زمانہ میں جنگ کرتا تھا اور دوسرا گرمیوں کے موسم میں۔ عبداللہ بن قیس حارثی کو امیر البحر مقرر کیا تھا۔ وہ رومیوں کو سمندری راستہ سے حملہ کرنے کا موقعہ نہ دیتے تھے۔

واقعاتِ مصر

مصر کے والی آغازِ عہدِ عثمانی میں حضرت عمرو بن عاص تھے۔ ۲۵ھ میں شہنشاہِ روم نے اسکندریہ والوں سے خفیہ خط و کتابت کرکے انھیں بغاوت کے لیے آمادہ کیا۔ پھر اپنے ایک سپہ سالار کو زبردست جنگی بیڑہ دے کر اسکندریہ پر حملہ کرا دیا۔ رومی سپہ سالار نے اس پر قبضہ کر لیا۔ حضرت عمرو بن عاص کو معلوم ہوا تو انھوں نے فوراً جوابی حملہ کیا اور رومی لشکر کو شکست دے کر اس پر قبضہ کر لیا، اور اسکندریہ کی شہر پناہ کو منہدم کرا دیا۔ رومی بیڑے کے بہت سے جہازوں پر بھی قبضہ کر لیا۔

فتح افریقیہ

عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کی سالاری میں ایک لشکر افریقیہ کی فتح کے لیے روانہ کیا۔ مسلمانوں نے طرابلس سے طنجہ تک تمام شہر رومیوں کے ہاتھ سے چھین لیے، وہاں اپنی طرف سے حاکم مقرر کیے، اور دو لاکھ پچاس ہزار دینار سالانہ ان سے خراج طے پایا۔ اس لڑائی میں حضرت عثمان نے مدینہ منورہ سے بھی امدادی فوج بھیجی، جس میں حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر شامل تھے۔

بحری جنگ

۳۱ھ میں قیصرِ روم نے ایک بہت بڑا جنگی بیڑا جس میں چھ سو جہاز شامل تھے، مصر پر حملہ کرنے کے لیے بڑے سازو سامان کے ساتھ بھیجا۔ والیِ مصر اُس وقت عبداللہ بن ابی سرح تھے۔ وہ بھی اپنا جنگی بیڑہ لے کر اسکندریہ سے مقابلہ کے لیے نکلے۔ ادھر حضرت معاویہ بھی اپنا امدادی جنگی بیڑہ لے کر شام سے نکلے۔ دونوں جنگی بیڑوں نے آگے بڑھ کر رومی بیڑے کا راستہ روک لیا۔ مسلمانوں نے اپنے بیڑے کے جہازوں کو رومیوں

کے بیڑے کے جہازوں سے ملا کر باندھ دیا۔ دونوں فریق ایک دوسرے کے جہازوں میں گھس گئے، اور سمندر کی سطح پر ہولناک جنگ ہوئی۔ مقتولین کے خون سے سمندر کی سطح سُرخ ہو گئی۔ آخر مجاہدینِ اسلام نے رومیوں کو شکست فاش دی اور ان کے سیکڑوں جہاز چھین لیے۔ رومی سپہ سالار سخت زخمی ہوا۔ دونوں اسلامی بیڑے فتح و کامرانی کے پھریرے اڑاتے ہوئے اپنے اپنے مُلک واپس آئے۔

یوں، حضرت عثمان کے زمانہ میں خلافتِ اسلامیہ ایک عظیم الشان بحری قوّت بن گئی، جس نے رومیوں کو مصر و شام کے ساحلوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کا موقعہ نہ دیا۔[1]

---

[1] محاضرات خضری ج ۲ ص ۳۶

یزدگرد کا قتل

حضرت عثمان کے عہدِ خلافت کا ایک اہم واقعہ، شہنشاہِ ایران یزدگرد کا قتل ہے۔

پہلے، حالاتِ عہدِ فاروقی میں بیان کیا جا چکا ہے کہ مسلمانوں کی تسخیرِ ایران کے بعد، یزدگرد، خاقانِ چین کے پاس فرغانہ چلا گیا تھا۔

مگر اب بھی اپنی چھنی ہوئی حکومت کی واپسی کے خواب دیکھتا رہتا تھا، اور مسلمانوں کے مفتوحہ علاقوں میں گشت کر کے وہاں بغاوتیں کراتا رہتا تھا۔ چنانچہ حضرت عثمان کے عہد کی اکثر بغاوتیں اسی کی جد و جہد کے نتیجے میں ہوئیں۔

وہ اسی طرح رَے، بلخ، مرو و خوارزم کے شہروں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ وہ جہاں جاتا اس کے پُرانے اثر و اقتدار کی وجہ سے اسے کچھ ساتھی بھی مِل جاتے۔

آخر وہ اسی خاک افشانی میں ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ مرو پہنچا اور وہاں کے لوگوں سے مدد طلب کی۔ انھوں نے اس کی مدد کر کے، اپنے آپ کو خطرات میں مُبتلا کرنا پسند نہ کیا بلکہ اس کو گرفتار کر کے فائدہ اٹھانا چاہا۔

مگر یزدگرد وہاں سے بھاگ لیا۔ اب اس کے بچے کھُچے ساتھیوں نے بھی اسے چھوڑ دیا تھا، اور وہ تنہا تھا۔ اسی پریشانی اور سرگردانی کے عالم میں وہ مرغاب کے کنارہ پہنچا۔ وہاں ایک پَن چکّی والے سے رات بھر کے لیے پناہ چاہی۔ اس نے اسے پناہ دے دی۔ مگر اس کے قیمتی لباس، مُرصّع پٹکے اور جواہر نگار تاج کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ یہ کوئی بڑا آدمی ہے۔

صبح کو جب وہ سو کر اٹھا تو اس نے چکّی والے سے کہا: میں بہت بھوکا ہوں

میرے لیے کچھ کھانے کے لیے لاؤ۔ چکّی والے نے جو کچھ اس کے یہاں تھا لاکر سامنے رکھ دیا۔ یزدگرد نے کہا کوئی ساز ہو تو لاؤ۔ میں کھانا کھاتے وقت کچھ گانے بجانے کا عادی ہوں۔ چکّی والے کے پاس ساز نہ تھا۔ وہ قریبی شہر کے کسی امیر سے ساز مانگنے گیا اور اپنے مہمان کا حلیہ اور اس کی فرمائش کا ذکر کیا۔ امیر سمجھ گیا کہ یہ یزدگرد کے سوا اور کوئی نہیں۔ اس نے اپنے آدمیوں کو بھیجا کہ اس کو قتل کرکے اس کا ساز و سامان لے آؤ۔ چنانچہ ان لوگوں نے اسے قتل کرکے، اس کا جسم دریائے مرغاب کی موجوں کے حوالہ کیا اور ساز و سامان اپنے آقا کے حوالہ کردیا۔ یہ واقعہ ۳۱ھ کا ہے[1]

اس طرح ہزاروں سال کی عجمی شہنشاہیت کا آفتاب مرغاب کی لہروں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ اور رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی: هَلَكَ كِسْرىٰ ثُمَّ لَا يَكُونُ كِسْرىٰ بَعْدَهٗ (کسریٰ ہلاک ہوگیا پھر کوئی کسریٰ اس کے بعد نہ ہوگا) (بخاری)

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۱۵۵

مُفسدوں کی سازش
اور
انقلاب کی کوشش

اسبابِ اختلافِ اُمّت

حضرت عثمان کے عہد کے ابتدائی چھ سال تو امن و عافیت کے ساتھ گزرے، اور فاروقِ اعظم نے اپنے زمانہ میں نظامِ اسلامی کا جو قصرِ رفیع تیار کر دیا تھا اس میں کوئی رخنہ نہ پڑا۔ مگر زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہے اور دُشمنانِ اسلام کی سازشیں بے کار نہ گئیں۔ آخر ملتِ اسلامیہ کی وحدت کا جامہ پارہ پارہ ہو گیا، اور نظامِ اسلامی کے قصرِ رفیع میں ایسی دراڑیں پڑ گئیں جو آج تک بھری نہ جا سکیں۔ اس کی وجوہات یہ ہیں:

(۱) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مسندِ خلافت پر فائز ہوئے تو ۲۲۵۱۰۳ مربع میل پر حکومتِ اسلامی کا پرچم لہرا رہا تھا۔ ایک طرف مدینہ منورہ سے کرمان و خراسان تک اور دوسری طرف افریقیہ و ایشیائے کوچک تک کے ممالک اسلام کے زیرِ نگیں تھے۔

حضرت عمر کے آخری عہد میں عراق کے صوبہ کا خراج دس کروڑ بیس ہزار دِرَم اور مصر کا پانچ کروڑ چھ لاکھ درم تھا۔ دوسرے صوبوں کی آمدنی اس کے علاوہ تھی۔

غرض عہدِ فاروقِ اعظم میں دولت کی ہر طرف ریل پیل تھی۔ مگر انھوں نے اسے اپنے پاؤں تلے روندا اور اپنے ہاتھوں کو اس سے آلودہ کرنا پسند نہ کیا۔ آپ اپنے گورنروں اور عاملوں کو بھی سادہ زندگی بسر کرتے دیکھنا چاہتے تھے۔ سعد بن ابی وقاص والیِ عراق اور عیاض بن غنم عاملِ مصر سے احتساب کے واقعات پہلے بیان کیے جا چکے ہیں۔

مگر حضرت عثمان ہمیشہ سے امیر کبیر تھے۔ اسلام کی غربت کے زمانہ میں اپنی دولت سے اسے بڑی قوت پہنچائی۔ غزوۂ تبوک میں دس ہزار کے لشکر کے اخراجات اپنے ذمہ لیے تھے۔ اور چشمۂ رومہ خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کیا تھا۔ مسجدِ نبوی میں بھی اپنے خرچ پر بڑی توسیع کی تھی۔ خود بھی اچھا کھاتے اور پہنتے تھے۔ مکان بھی مدینہ منورہ میں نہایت وسیع تھا۔ آپ کے زمانہ میں فقر اور سادگی کی حالت باقی نہ رہی تھی۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے دشمن ایرانی اور رومی مغلوب ہو چکے تھے۔ اب مسلمانوں میں مجاہدانہ زندگی کی روح تحلیل ہونے لگی تھی اور دولت و حکومت سے فائدہ اٹھانے کا جذبہ دلوں میں چٹکیاں لے رہا تھا۔ اس جذبہ کے بروئے کار آنے پر کوئی پابندی بھی نہ رہی تھی۔

بصرہ و کوفہ و دمشق کے علاوہ مدینہ منورہ میں بھی شاندار محلات و باغات بکثرت نظر آتے تھے اور خوراک و پوشاک میں بھی تکلفات برتے جانے لگے تھے۔

دولت کے دوسرے لوازم بھی آہستہ آہستہ اسلامی معاشرہ میں سرایت کرنے لگے تھے۔ حرص و طمع، جاہ پسندی، خود غرضی، فخر و مباہات اور ان کے نتیجہ میں بغض و حسد، مخالفت و عناد نے آہستہ آہستہ اسلامی وحدت کے شیرازہ کو بکھیرنا شروع کر دیا۔ اور اس خطرہ کے ظہور کا وقت آگیا جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا:

اِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ عَلَیْکُمُ الدُّنْیَا۔	میں سب سے زیادہ تمہارے لیے جس چیز سے ڈرتا ہوں وہ دنیا ہے۔

(۲) حضرت فاروقِ اعظم اپنے زمانہ میں اکابرِ قریش کو مدینہ منورہ سے باہر نہ جانے دیتے تھے۔ بلکہ اپنے کابینہ کے ممبر کی حیثیت سے، اُن سے اہم امور میں مشورہ کرتے رہتے تھے، اور ان کے اثر و رسوخ سے مرکز کو مضبوط بنائے رکھتے تھے۔ اگر وہ کسی غزوہ میں باہر جانے کی خواہش بھی کرتے تو فرماتے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تم نے جو قربانیاں دی ہیں وہ تمہارے لیے بہت کافی ہیں۔ اب بہتر یہی ہے کہ نہ تو تم دُنیا کو دیکھو اور نہ دنیا تم کو دیکھے۔

حضرت عثمان کے زمانہ میں یہ پابندی باقی نہ رہی۔ خلافتِ عثمانی کے پہلے ہی سال ساداتِ قریش نے عالمِ اسلامی کے مختلف شہروں میں بڑی بڑی جائدادیں پیدا کرلیں اور وہاں شاندار مکانات میں امیرانہ انداز سے رہنے لگے۔ ان کی حیثیت شاہی خاندان کے افراد کی تھی۔ ان میں سے ہر ایک اسلامی حکومت میں خلیفہ کی حیثیت سے منتخب ہو سکتا تھا۔ خود غرض اور جاہ پسند لوگوں کا مجمع ان کے اردگرد رہنے لگا۔ یہ ان کی خوشامد میں لگے رہتے اور اقتدار پر قابض ہونے کی ان کو ترغیب بھی دیتے۔ وہ متوقع تھے کہ اگر ان کا امیدوار مسندِ حکومت پر فائز ہو گیا تو اس سے ہر قسم کا فائدہ اُٹھائیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکابرِ قریش میں پچھلا اتفاق و اتحاد باقی نہ رہا۔ مختلف صوبوں میں مختلف بزرگوں کے اپنے اپنے خیرخواہوں کے گروہ بن گئے۔ خود ان کے دلوں میں بھی خلیفہ بننے کی آرزوئیں کروٹ لینے لگیں۔

(۳) حضرت عثمان اور حضرت عمر کے مزاج میں بھی بڑا فرق تھا۔ حضرت عمر حق کو جاری کرنے کے معاملہ میں بہت سخت تھے۔ جب کسی بات کو مصلحتِ امت کے مطابق سمجھتے تو اسے کر گذرنے میں کسی قرابت و دوستی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ حضرت عثمان میں "حیاء" کی صفت غالب تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "عثمان کی حیا کی وجہ سے فرشتے بھی ان سے شرماتے ہیں۔" اس کے ساتھ بہت نرم مزاج تھے۔ اہم معاملات میں بھی کسی سے سخت برتاؤ نہ کرتے تھے۔

ان دونوں صفات کی خوبی سے ذاتی معاملات میں انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر حکومت اور سیاست میں ان کا دخل خطرناک نتائج کا سبب بن سکتا ہے۔

حضرت خالد سیف اللہ کے اِسراف کی شکایت حضرت عمر تک پہنچی تو حمص سے ان کی دستار میں ان کے ہاتھ بندھوا کر مدینہ منورہ بُلوالیا۔ مگر حضرت عثمان نے، جب مُفسدین نے مدینہ منورہ میں ان کے مکان کو گھیر لیا تو ان سے جنگ کرنے کی بھی اپنے حامیوں کو اجازت نہ دی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مُفسدوں اور شر پسندوں کے دل سے ان کا خوف اٹھ گیا، اور ان کو فتنہ و فساد کی آزادی مل گئی۔

(۴) عہدِ شیخین (حضرت صدیقِ اکبر و حضرت فاروقِ اعظم) میں صحابۂ کرام جنھوں نے رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صُحبت سے استفادہ کیا تھا اور جن کے سینوں میں نورِ نبوّت کی روشنی جگمگا رہی تھی، بکثرت موجود تھے۔ مفتوحہ علاقوں میں بھی جہاں جہاں وہ پہنچے انھوں نے اسلامی آداب و اخلاق سے وہاں کے لوگوں کو سنوارا اور نکھارا، اور معاشرہ کو اسلامی سانچہ میں ڈھالا۔ حضرت عثمان کے زمانہ میں ان میں سے اکثر راہیِ ملکِ بقا ہو چکے تھے۔ اب جو نئی نسل عربوں کی اُبھر رہی تھی اس میں بھی وہ اعلیٰ اخلاق و فضائل نہ تھے جو ان کے بزرگوں میں تھے، بلکہ مفتوحہ قوموں سے اختلاط کی وجہ سے اِن کی کمزوریاں اُن میں بھی پیدا ہونے لگی تھیں۔ خصوصاً عربوں کی وہ نسل جو رومی اور ایرانی ماؤں کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ اس لیے حضرت عثمان کے زمانہ کا معاشرہ، پہلے معاشرہ سے مختلف تھا۔

(۵) اسلام سے پہلے قریش میں دو خاندان سب سے زیادہ سربرآوردہ سمجھے جاتے تھے: بنی ہاشم اور بنی امیہ۔ دونوں میں اقتدار کے لیے باہمی کش مکش بھی جاری رہتی تھی مگر اسلام کی آغوش میں آکر دونوں شیر و شکر ہو گئے تھے اور پچھلی تلخیاں بھول گئے تھے۔ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے حُسنِ سلوک سے اس جذبہ کو اُبھرنے نہ دیا۔ فتح مکہ کے موقعہ پر رئیسِ بنی امیہ ابو سفیان کے گھر کو خانہ کعبہ کی طرح

دار الامن قرار دیا۔ اور غزوۂ تبوک میں ان کو اور ان کے فرزندوں کو مالِ غنیمت سے اتنا کچھ دیا کہ وہ نہال ہو گئے۔ پہلے دو خلیفہ حضرت ابوبکر و حضرت عمر نہ ہاشمی تھے نہ اُموی، مگر حضرت عثمان بنی امیہ کے گل سرسبد تھے اور حضرت علی بنی ہاشم کے چشم و چراغ، اس لیے حضرت عمر کے بعد، جب حضرت علی کے مقابلہ میں حضرت عثمان خلیفہ منتخب کیے گئے تو یہ جذبۂ خفتہ بیدار ہوا۔ پھر جب حضرت عثمان نے اپنے بعض عزیزوں کو عہدے دیے تو اگرچہ وہ اس کے اہل تھے، مگر بنی ہاشم اور دوسرے قبیلوں کو اس سے شکایت پیدا ہوئی اور اُموی اور ہاشمی کش مکش کے جسمِ مُردہ میں نئی زندگی کی لہر پیدا ہو گئی۔

اِن وجوہات اور اسباب کی وجہ سے جب زمین تیار ہو گئی تو دُشمنانِ اسلام اور منافقینِ دین نے فتنہ و فساد کے بیج بکھیر دیے، اور اس سے ببول کے وہ درخت اُگے، جن کے کانٹوں سے وحدتِ ملتِ اسلامیہ کی قبا تار تار ہو گئی اور آج تک اس میں رفو نہ ہو سکا۔

مخالفانہ تحریک

مفتوحہ ممالک میں بہت سے تو وہ نومُسلم تھے جنھوں نے اسلام کی اعلیٰ تعلیمات اور فاتحین کے حسنِ سلوک سے متاثر ہو کر سچے دل سے اسلام قبول کیا تھا۔ ان میں ہزاروں عُلماء، صُلحاء اور مُصنفین پیدا ہوئے، جن کے عظیم کارنامے تاریخ اور رِجال کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ مگر خاصی تعداد میں وہ بھی تھے جن کی گردنیں اسلام کی طاقت و شوکت کے سامنے جُھک گئی تھیں مگر دل کفر و نفاق سے پاک نہ ہوئے تھے۔ یہ بیشتر وہ ایرانی و رومی تھے جو اپنے اَسلاف کی مٹی ہوئی شان و شوکت کو یاد کر کے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ کوئی ایسی صورت پیدا ہو کہ خلافتِ اسلامیہ کی طاقت ٹوٹے اور وہ اپنے بزرگوں کی عظمتِ رفتہ کو واپس لا سکیں۔ یہی وہ لوگ تھے جو وقتاً فوقتاً اپنے علاقوں میں بغاوت پھیلانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔

اِنہی میں وہ یہودی بھی تھے جو اپنی مکّاری، عیّاری، غدّاری اور فریب کاری کی وجہ سے تاریخِ عالم میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ انبیاءِ بنی اسرائیل کے ساتھ ان کا جو ظلم و جفا کا معاملہ رہا ہے، قرآنِ کریم اور بائبل میں بھی اس کا ذکر جا بجا موجود ہے اور رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد آپ کے ساتھ اور آپ کے صحابہ کے ساتھ انھوں نے جیسا مکّاری اور غدّاری کا سلوک کیا اس سے حدیث و سیرت کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

عبداللہ ابنِ سبا

اِسی بدطینت جماعت کا ایک فرد، ابو السوداء عبداللہ ابنِ سبا تھا۔ اس نے اپنے سازشی دماغ اور عیّارانہ حکمتِ عملی سے، مسلمانوں کی ملّی وحدت اور ان کی طاقت و قوت کو پارہ پارہ کرنے کی ایک اسکیم بنائی۔ وہ اس مقصد کے لیے مدینہ منورہ پہنچا اور وہاں کچھ مدّت رہ کر مسلمانوں کی نفسیّات کا مطالعہ کیا۔ ان کے محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نازک جذبات کا اندازہ کیا۔ زمانہ کے تغیرات سے ان میں جو کمزوریاں پیدا ہو رہی تھیں، ان کا بھی اندازہ لگایا۔ پھر اس نے ایک نئے مذہب کا خاکہ بنایا جس سے وہ مسلمانوں میں اختلاف اور ان کی قوت میں اضمحلال پیدا کر سکے۔

اس مذہبِ سبائی کی بنیادی باتیں یہ تھیں:

(ا) عجیب بات ہے کہ مسلمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دنیا میں دوبارہ آنے کے تو قائل ہیں، اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دوبارہ ظہور کو نہیں مانتے حالانکہ وہ ان سے افضل ہیں۔ وہ دنیا میں دوبارہ ضرور آئیں گے۔

(ب) ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے جو اس کا جانشین ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ کے وصی حضرت ہارون تھے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی حضرت علی ہیں جو ان کے جانشین ہیں۔ جس طرح حضرت محمدؐ خاتم الانبیاء ہیں اسی طرح حضرت علی خاتم الاوصیاء ہیں۔

(ج) بڑا ظلم ہے کہ مسلمانوں نے اپنے نبی سے اتنی محبت رکھنے کے باوجود ان کے وصی اور داماد کو ان کا جانشین نہ بنایا اور ایک غیر شخص عثمان کو جانشین بنا دیا۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ موجودہ غیر مستحق خلیفہ حضرت عثمان کو معزول کریں اور اپنے پیغمبر کے حقیقی جانشین اور وصی حضرت علی کو ان کی جگہ خلیفہ بنائیں۔[۱]

ابنِ سبا نے اپنے آپ کو اس مذہب کا داعیِ اعظم قرار دیا اور لائحۂ عمل یہ تجویز کیا کہ مسلمانوں کے محبتِ رسول کے جذبہ سے فائدہ اٹھا کر اور حضرت عثمان کے مخالفین سے ساز باز کر کے اس مذہب کو مسلمانوں میں پھیلایا جائے۔ اس مذہب کے مبلغ بظاہر متقی اور دیندار اور مقدس اور پرہیزگار بن کر عوام پر اپنا اثر و اقتدار پیدا کریں۔

حضرت عثمان کے خلاف جھوٹے الزامات عائد کیے جائیں اور ان کو ایک غاصب، نااہل، خویش پرور اور جابر حکمراں ثابت کر کے ان کے خلاف تحریک چلائی جائے۔ مختلف صوبوں میں ان کے گورنروں اور حاکموں کو نالائق، غیر متدین، خائن اور ظالم بتا کر ان کے خلاف لوگوں کو بھڑکایا جائے۔ اور ملک میں بدامنی اور انتشار پیدا کیا جائے۔

عبداللہ بن سبا نے اس اسکیم کو تیار کر کے عالمِ اسلام میں اس کے نفاذ اور سبائی مذہب کی اشاعت کے لیے، اسلامی صوبوں کے مرکزی شہروں میں دورہ کرنے اور وہاں اپنی جماعت کی شاخیں قائم کرنے کا ایک جامع پروگرام بنایا۔

بصرہ و کوفہ بصرہ میں ایک شخص حکیم بن جبلہ تھا جو وہاں کے غنڈوں کا سردار تھا۔ بصرہ سے جب لشکرِ اسلام غزوات کے لیے باہر جاتا تو یہ ذمیوں کا مال و اسباب لوٹ لیتا۔ بصرہ کے والی اُس زمانہ میں

---

[۱] البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۱۶۷ / ص ۱۶۸۔

عبداللہ بن عامر تھے جو ایک بہادر اور مُدبّر شخص تھے۔ انھوں نے حضرت عثمان سے اجازت لے کر حکیم بن جبلہ کو بصرہ میں نظر بند کر دیا۔ ابنِ سبا بصرہ آیا تو حکیم کا مہمان ہوا۔ حکیم اس کی پارٹی میں شامل ہو گیا۔ اور ابنِ سبا نے اس کی مدد سے وہاں سبائی جماعت کی ایک تنظیم قائم کر لی۔ اور اپنے عقائدِ فاسدہ کی اشاعت شروع کر دی۔

امیرِ بصرہ عبداللہ بن عامر کو خبر ہوئی تو انھوں نے اس کو طلب کر کے پوچھا: تم کون ہو؟ اس نے کہا: میں اہلِ کتاب میں سے تھا، اسلام کی صداقت نے میرے دل میں گھر کیا اور اب مسلمان ہوں۔ مگر عبداللہ بن عامر نے اس کی بات پر اطمینان نہ کیا اور اسے بصرہ سے نکال دیا۔

بصرہ سے نکل کر ابن سبا کوفہ آیا، یہاں بھی اس نے اپنی جماعت کی تشکیل کی اور مخالفینِ حکومت کو اپنے ساتھ ملایا۔ مگر جلد ہی یہاں کے والی نے بھی اسے نکال دیا۔

شام کوفہ سے چل کر ابنِ سبا ملکِ شام آیا۔ یہاں کے گورنر حضرت معاویہؓ تھے، جو ایک مُدبّر، ہوشمند اور طاقت ور حکمراں تھے، اور اپنے ملک میں امن و امان قائم رکھے ہوئے تھے۔ انھوں نے ابنِ سبا کو اپنی تحریک چلانے کا موقع نہ دیا۔ مگر یہاں ابنِ سبا نے مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے کے لیے ایک اور راہ اختیار کی۔

شام ایک سرسبز اور زرخیز ملک تھا۔ یہاں کے مسلمان خوشحال اور صاحبِ دولت تھے۔ اسی طرح سرکاری خزانہ بھی معمور تھا۔ یہاں ایک بزرگ صحابی حضرت ابوذرؓ مقیم تھے۔ یہ اصحابِ صُفّہ میں سے تھے، ساری زندگی درویشانہ انداز سے گزاری تھی اور طبعاً مال و دولت کو پسند نہ کرتے تھے۔ وہ بیت المال میں کسی رقم کے جمع ہونے کو بھی پسند نہ کرتے تھے اور مسلمانوں کو بھی دولت سے کنارہ کش دیکھنا چاہتے تھے۔

ابنِ سبا ان کے پاس پہنچا اور ان کو بہکایا کہ حضرت معاویہ نے بیت المال میں بڑی رقم جمع کر رکھی ہے اور وہ اسے اللہ کا مال قرار دیتے ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ عام مسلمانوں کا اس میں حصہ نہیں ہے۔ حضرت ابو ذرؓ حضرت معاویہ کے پاس پہنچے اور ان سے پوچھا کہ آپ بیت المال کو اللہ کا مال کیوں بتاتے ہیں حضرت معاویہ نے فرمایا! اے ابو ذر، ہم سب اللہ کے بندے ہیں، ساری مخلوق اس کی ملکیت ہے، ہمارا تمہارا مال بھی اللہ ہی کا ہے۔ حضرت ابو ذر نے کہا اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ تم اس مال کو مسلمانوں پر خرچ کرنا نہیں چاہتے۔ حضرت معاویہ نے کہا: حاشا و کلاّ میرا یہ مقصد نہیں، آئندہ میں اسے مسلمانوں کا مال ہی کہا کروں گا۔

پھر ابو ذر نے ابنِ سبا کے شہ دیئے پر مالدار مسلمانوں کے خلاف وعظ کہنا شروع کر دیا۔ وہ اس آیت سے استدلال کرتے:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ	اور جو لوگ سونے اور چاندی کو گاڑ کر رکھتے
وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ	ہیں اور اللہ کے راستہ میں خرچ نہیں کرتے
بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ الْاٰيَه	ان کو دردناک عذاب کی بشارت دیدو

اصحاب دولت نے کہا کہ ہم اپنے مالوں کی زکوٰۃ دیتے ہیں اس لیے یہ وہ مال نہیں ہے جسے گاڑ کر رکھا جاتا ہے۔

مگر حضرت ابو ذر اس سے مطمئن نہ ہوئے اور امیروں کے خلاف اپنی تقریریں جاری رکھیں۔ غربا اور فقرا کی اچھی خاصی جماعت ان کی ہم نوا ہو گئی اور امیری اور غریبی کے سوال پر نئی کش مکش شروع ہو گئی۔

اُمرا نے حضرت معاویہ سے حضرت ابو ذر کی شکایت کی۔ انھوں نے حضرت عثمان کو مدینہ منورہ لکھا۔ حضرت عثمان نے ان کو حکم دیا کہ ابو ذر کو مدینہ بھیج دیا جائے۔ چنانچہ وہ مدینہ منورہ پہنچے۔ یہاں بھی حالات بدل چکے تھے۔ کچے مکانات اور جھونپڑیاں محلات اور حویلیوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ حضرت ابو ذر نے یہاں

بھی وہی تقریریں شروع کر دیں۔

حضرت عثمان نے جب یہ دیکھا کہ یہ اپنے مزاج اور اُفتادِ طبیعت سے مجبور ہیں تو ان کو مدینہ منورہ کے مضافات میں رَبذَہ ایک مقام پر بھیج دیا، جہاں انھوں نے اپنی باقی عمر عبادت و ریاضت میں گذار دی۔ ۳۲ھ میں وفات پائی۔

حضرت ابو ذر کے بعد شام میں ابنِ سبا ایک دوسرے ممتاز صحابی حضرت ابو الدرداء کے پاس گیا جو وہاں حضرت عمر کے زمانہ سے تعلیم و تبلیغ کے لیے مقیم تھے، اور جامعِ دمشق کے مدرسۃ القرآن کے ناظم تھے، اور ان کو بھی بہکانا چاہا۔ حضرت ابو الدرداء نے اس کی باتیں سُن کر کہا تم مجھے یہودی معلوم ہوتے ہو"۔ پھر وہ حضرت عبادہ بن صامت ایک تیسرے بزرگ صحابی کے پاس پہنچا اور ان سے بھی اپنے عقائدِ باطلہ کا اظہار کیا۔ وہ اسے پکڑ کر حضرت معاویہ کے پاس لے گئے۔ آخر، اسے شام سے بھی نکلنا پڑا۔

مصر

شام سے نکل کر ابنِ سبا مصر پہنچا۔ مصر کے گورنر عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح تھے، ان کو اہلِ مصر پسند نہ کرتے تھے۔ پھر ان کو افریقہ اور بحرِ روم کی جنگوں میں مشغولیت کی وجہ سے مصر کے داخلی معاملات کی طرف توجہ کی فرصت نہ تھی۔ یہاں محمد بن ابو بکر اور محمد بن ابی حذیفہ بھی موجود تھے، جن کے دل حضرت عثمان کی طرف سے صاف نہ تھے۔

محمد بن ابو بکر کی والدہ اسماء بنت عمیس نے حضرت ابو بکر کی وفات کے بعد حضرت علی رضؓ سے نکاح کر لیا تھا اور محمد بن ابو بکر نے حضرت علی ہی کی آغوش میں تربیت پائی تھی۔ ان پر کسی کا کچھ مطالبہ تھا، حضرت عثمان نے ان کے خلاف ڈگری دیدی تھی۔ یہ اس بات سے ناراض تھے۔

محمد بن ابی حذیفہ یتیم تھے۔ دوسرے یتیموں کی طرح حضرت عثمان نے ان کی بھی کفالت کی تھی۔ جب بڑے ہوئے تو انھوں نے کسی جگہ کی ولایت کی خواہش کی۔ حضرت عثمان نے ان کا مطالبہ پورا نہ کیا تو وہ ان سے ناراض ہو کر مصر چلے آئے۔

ابنِ سبا ان دونوں کے پاس پہنچا اور حضرت عثمان کی مخالفت کے لیے ان کو اپنا ہم نوا بنا لیا۔

مصر کی سرزمین ان حالات میں ابنِ سبا کے لیے اپنی جماعت کو سرسبز بنانے کے لیے زیادہ موزوں نظر آئی۔ چنانچہ اس نے مصر کو مرکز بنا کر پوری سرگرمی کے ساتھ کام شروع کر دیا۔

فتنہ پردازی کی مہم

مصر میں سبائی مرکزی جماعت کی تنظیم کی گئی، جن لوگوں نے ابنِ سبا کے عقائدِ باطلہ کو نہ مانا، ان کو اس حد تک ہمدرد بنا لیا گیا کہ حضرت عثمان کی معزولی کی مہم میں اس کی مدد کریں۔

چنانچہ یہاں سے بصرہ کوفہ وغیرہ صوبوں کی جماعت کے ذمہ داروں کو خطوط بھیجے گئے، جن میں مصر میں حضرت عثمان کے خلاف شورش اور بے اعتمادی کی فرضی داستانیں لکھی گئیں اور ان کو ہدایت کی گئی کہ وہ اپنے اپنے صدر مقام سے دوسرے صوبہ جات اور اضلاع میں، مصر اور اپنے صوبوں میں بدامنی، شورش اور حضرت عثمان کے خلاف نفرت و بغاوت کی من گھڑت داستانیں لکھ لکھ کر بھیجیں۔ اور اُن صوبوں کے ذمہ داروں کو ہدایت کی جائے کہ وہ ایسے ہی خطوط اپنے یہاں سے دوسرے مقامات پر روانہ کریں۔

چنانچہ ان ہدایات پر عمل کیا گیا اور اس کے نتیجہ میں ہر صوبہ میں حکومت اور اس کے عاملوں کے خلاف نفرت اور شورش کے جذبات پیدا ہو گئے۔ ہر جگہ کے لوگ یہ سمجھتے کہ بس ہم ہی امن و آرام میں ہیں ورنہ سارا عالمِ اسلام فتنہ و فساد کا مرکز بنا ہوا ہے اور خلیفۂ وقت سے سب بدگمان اور ناراض ہیں۔ ایسا سمجھا جانے لگا کہ حضرت عثمان کے اقتدار کا سورج ڈوبنے والا ہے اور آئندہ ان کے جانشین کے انتخاب کے لیے رائے زنی ہونے لگی ہے

ہے تاریخ الاسلام السیاسی ج ۱ ص ۲۷۶

اہلِ مصر، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرفدار تھے، اہلِ بصرہ حضرت طلحہ کے حامی تھے اور اہلِ کوفہ حضرت زبیر کو پسند کرتے تھے۔

عُمّال کی مجلسِ مُشاورت

مدینہ منورہ میں بھی ان شورش پسندوں کے بھیجے ہوئے خطوط بکثرت پہنچے۔ ان کے علاوہ مختلف صوبوں کے والیوں نے بھی ان مُفسدوں کی حرکات سے امیرالمومنین کو مطلع کیا۔ آخر مرکزی ذمہ دار اصحاب کے مشورہ سے حضرت عثمان نے تمام صوبوں کے اُمراء کی مجلسِ شوریٰ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور ان کو حج کے زمانہ میں مدینہ منورہ میں طلب کیا۔

چنانچہ یہ مجلس منعقد ہوئی۔ اور امیر معاویہ، عبداللہ بن ابی سرح، سعید بن عاص اور عمرو بن عاص، عبداللہ بن عامر وغیرہ اس میں شریک ہوئے۔

حضرت عثمان نے ایک تقریر میں، ملک میں مفسدین کی سرگرمیوں اور مختلف صوبوں سے بدامنی اور شورش کی آمدہ اطلاعات کا ذکر کیا، پھر اُمراء سے کہا کہ آپ صاحبان اپنے اپنے یہاں کے حالات بیان کریں اور اس فتنہ کو رفع کرنے کی تدابیر سے مطلع کریں۔

تمام والیوں کی متفقہ رائے تھی کہ یہ سب کچھ ایک گہری سازش کا نتیجہ ہے اور اس کا مقصد حکومت اور اس کے عاملوں کو بدنام کرنا ہے۔

حضرت عثمان نے پوچھا: تو پھر اس کا انسداد کیوں کر ہو؟

سعید بن عاص نے کہا کہ یہ شورش ایک مخصوص گروہ نے پیدا کی ہے۔ اس گروہ کے سرداروں کو قتل کر دیا جائے تو ملک میں امن و امان قائم ہو جائے گا۔

عبداللہ بن سعد نے کہا: یہ لوگ لالچی اور زر طلب ہیں۔ مال و دولت دے کر ان کے منہ بند کیے جا سکتے ہیں۔

عبداللہ بن عامر نے کہا، یہ سب بیکاری کے مشغلے ہیں۔ کسی ملک پر فوج کشی کر دی جائے تو سب جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔

حضرت معاویہ نے کہا، یہ صوبوں کے عاملوں کی کمزوری ہے۔ ہر صوبہ کا عامل اپنے اپنے ہاں امن قائم رکھنے کی ذمہ داری لے، میں ملکِ شام کی پوری ذمہ داری لیتا ہوں۔

عمرو بن عاص نے کہا: یہ آپ کی بے جا نرمی کا نتیجہ ہے۔ حضرت ابوبکر و عمر کی سنت پر عمل کیجیے اور نرمی کے موقعہ پر نرمی اور سختی کے موقعہ پر سختی کیجیے۔

اس سے معلوم ہوا کہ تقریباً تمام والیوں کی یہ متفقہ رائے تھی کہ ملک میں شورش اور بدامنی کی داستانیں زیادہ تر فرضی ہیں۔ یہ مفسدین کی ایک جماعت کی سازش کا نتیجہ ہے۔ اس جماعت کا قلع قمع کیا جائے۔ مگر حضرت عثمان اپنی طبیعت سے مجبور تھے۔ وہ اس کے لیے تیار نہ ہوئے۔[1]

البتہ حضرت طلحہ کے مشورہ سے آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ مختلف صوبوں میں با اثر اصحاب کے وفود بھیجے جائیں جو حالات کی بھی تفتیش کریں اور وہاں کے لوگوں کی غلط فہمیاں بھی دور کریں۔

تحقیقاتی وفود

چنانچہ ۳۵ھ میں محمد بن مسلمہ کوفہ، اسامہ بن زید بصرہ، عبداللہ بن عمر شام اور عمار بن یاسر مصر بھیجے گئے۔ اور یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ اگر میرے کسی عامل یا حاکم سے کسی کو کوئی شکایت ہو تو حج کے موقعہ پر مجھ سے آکر ملے، میں فوراً اس کا تدارک کروں گا۔

ان وفود نے واپس آکر بیان کیا کہ صوبوں میں کوئی بدامنی نہیں ہے البتہ ایک گروہ (سبائی) فرضی بدامنی پیدا کرنا چاہتا ہے، اس کا تدارک کیا جائے۔

مگر عمار بن یاسر واپس نہ آئے، وہ مصر ہی میں رک گئے اور وہاں کے فتنہ پردازوں نے ان کو اپنا ہم نوا بنا لیا۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۱۶۷

مفسدین کے وفود مدینہ منورہ میں

اب طے یہ کیا گیا کہ مصر، کوفہ اور بصرہ تینوں مرکزوں سے ابن سبا کی جماعت کے کچھ سرکردہ اور چالاک لوگوں کو مدینہ منورہ بھیجا جائے۔ تاکہ وہ وہاں پہنچ کر حالات کا جائزہ لیں، مدینہ منورہ کی مقامی جماعت کے لوگوں سے بھی مشورہ کریں۔ وہاں کے اکابر کو بھی اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کریں، اور ظاہر یہ کیا جائے کہ امیرالمومنین کے اعلان کے مطابق ہم اپنے شبہات دور کرنے اور اپنی شکایات کا ازالہ کرانے کے لیے آئے ہیں۔

چنانچہ تینوں مقامات سے یہ وفود روانہ ہوئے اور مدینہ منورہ کے قریب پہنچ کر آپس میں مل گئے۔

حضرت عثمان کو ان کی آمد کا حال معلوم ہوا، تو اپنے جاسوسوں کو بھیج کر ان کا مقصد معلوم کیا۔ جو لوگ ان کے پاس بھیجے گئے تھے وہ ان کو اپنا ہی آدمی سمجھتے تھے۔ انھوں نے ان سے اپنا اصل مُدّعا بیان کر دیا کہ بظاہر تو ہم اپنی شکایات کے ازالہ کے لیے آئے ہیں مگر ہمارا اصل مقصد خلیفہ کو معزول کرنا یا قتل کرنا ہے۔

ان جاسوسوں نے جب حضرت عثمان کو ان مُفسدوں کے عزائم سے واقف کیا تو انھوں نے اپنے مُشیروں کو بُلایا۔ سب کی رائے یہ ہوئی کہ ان کو قتل کرا کر اس فتنہ کی سرکوبی کر دی جائے۔

مگر حضرت عثمان نے ہنس کر ان کی بات ٹال دی اور فرمایا میں کسی کو قتل اُسی وقت کر سکتا ہوں جب اس پر حدِّ شرعی واجب ہو یا وہ مُرتد ہو جائے۔ یہ میری طرف سے غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ میں ان کے شبہات دور کرنے کی کوشش کروں گا۔

اس کے بعد آپ نے ان مُفسدوں کو بھی بلایا اور مہاجرین و انصار کو بھی جمع کیا اور ایک مُدلّل اور مفصّل تقریر کی، جس میں اُن اعتراضات اور الزامات کے شافی جوابات دیے جو مخالفین آپ کے ذمہ عائد کرتے تھے۔ ہر اعتراض کے جواب کے بعد آپ حاضرین سے پوچھتے تھے کہ "کیا جو کچھ میں نے کہا وہ صحیح ہے؟" ہر طرف سے آوازیں آتیں کہ بے شک

بالکل صحیح ہے، ہم بالکل مطمئن ہیں۔"

بظاہر سبائیوں نے بھی یہی کہا، کہ ہم آپ کی تقریر سے بالکل مطمئن ہو گئے۔ مگر جن کی نیت ہی فساد ہو، ان کو دلائل و براہین سے کس طرح اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ مدینہ منورہ سے اپنے اپنے شہروں کو لوٹ گئے اور وہاں جا کر یہ شہرت دی کہ ہم نے خلیفہ سے اپنی شکایات بیان کیں اور ان سے ان کے ازالہ اور ملک کے حالات کی اصلاح کی درخواست کی۔ مگر انھوں نے ہماری درخواست کو ٹھکرا دیا اور کسی طرح اصلاحِ حالات کے لیے تیار نہ ہوئے۔

مفسدین کی مدینہ منورہ روانگی

آخر اب وقت آگیا کہ عبداللہ ابن سبا اپنے پروگرام کو آخری طور پر مکمل کرے۔

مصر، کوفہ اور بصرہ سے مفسدین کی ایک ایک ہزار کی جماعت مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوئی۔ انھوں نے ظاہر یہ کیا کہ حج کے ارادہ سے جا رہے ہیں اور ہر جگہ کے مفسدین چار چار گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ تجویز یہ تھی کہ حج کے زمانہ سے پہلے ہی یا تو خلیفہ کو معزول کر دیں یا ان کو شہید کر دیں۔ چنانچہ یہ سب مدینہ منورہ کے قریب آکر ایک دوسرے سے مل گئے۔ پھر تینوں گروہ کے سرکردہ افراد نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے تگ و دو شروع کر دی۔ اہلِ مصر حضرت علی کے پاس گئے، اور ان سے حضرت عثمان کی معزولی میں مدد چاہی اور خلافت کی ذمہ داری قبول کرنے کی درخواست کی۔ مگر حضرت علی نے سختی کے ساتھ انکار کر دیا، اسی طرح بصرہ کے لوگ حضرت طلحہ کے پاس، اور کوفہ کے حضرت زبیر کے پاس پہنچے اور یہی درخواست ان سے کی۔ ان دونوں نے بھی ان کو صاف جواب دے دیا۔

حضرت علی نے یہ بھی فرمایا کہ "دیندار لوگوں کو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ذی مروہ اور ذی خشب سے آنے والے ملعون ہیں"۔ یہ مدینہ منورہ کے قریب کے وہ مقامات ہیں جہاں یہ مفسدین مقیم ہوئے تھے۔ حضرت عثمان کی درخواست پر انھوں نے مفسدین کو مدینہ منورہ سے واپس جانے پر بھی آمادہ کر لیا۔

اپنے نامزد بزرگوں سے مایوس ہو کر مفسدین کے یہ سرگروہ یہ کہہ کر مدینہ منورہ سے نکلے کہ ہم اپنے اپنے مقامات کو واپس جا رہے ہیں۔ اہلِ مدینہ خوش ہوئے کہ مصیبت ٹلی اور سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔

مگر ابھی چند ہی روز گزرے تھے کہ مدینہ کی گلیاں مفسدین کے نعروں سے گونجنے لگیں۔ اہلِ مدینہ حیران رہ گئے۔ حضرت علی نے ان سے پوچھا کہ تم تو اپنے اپنے گھروں کو واپس جانے کا عہد کر کے گئے تھے۔ پھر مدینہ منورہ کیوں واپس آ گئے؟ اہلِ مصر نے کہا کہ ہم لوگ مصر جا رہے تھے، کہ ہم کو ایک ناقہ سوار ملا جو تیزی کے ساتھ ہم سے آگے مصر جا رہا تھا۔ اس کو مشکوک سمجھ کر ہم نے اس کی تلاشی لی۔ اس کے پاس سے حاکمِ مصر عبداللہ بن ابی سرح کے نام ایک خط ملا جس میں ہمیں قتل کر دینے کا حکم تھا۔ اس پر حضرت عثمان کی مُہر تھی۔ اب ہم اس لیے لوٹ آئے ہیں کہ اس بدعہدی کا انتقام لیں۔ اب ہم ایسے شخص کو ہرگز مسندِ خلافت پر نہ رہنے دیں گے اور اسے بزور معزول کر دیں گے۔

پھر، اہلِ کوفہ اور اہلِ بصرہ سے یہی سوال کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ ہم اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے واپس آ گئے۔ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر نے کہا، تمہارے راستے تو الگ الگ ہیں۔ پھر تمہیں اہلِ مصر سے ملاقات کا موقعہ کیسے ملا؟ تم تو اپنے راستوں پر کافی فاصلہ طے کر چکے ہوں گے۔ یہ تمہاری سازش ہے۔

اس پر، انھوں نے کہا: آپ جو چاہیں سمجھ لیں۔ اب تو ہم عثمان کو معاف نہ کریں گے اللہ نے ان کا خون ہمارے لیے حلال کر دیا ہے۔

حضرت عثمان سے اس خط کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے قسم کھا کر کہا کہ نہ میں نے اس مضمون کا کوئی خط لکھا، نہ لکھوایا اور نہ میرے علم میں ہے۔ رہی مُہر کی بات، تو وہ جعلی بھی بنائی جا سکتی ہے۔

آخر، ان مفسدین نے مدینہ منورہ میں کہرام مچا دیا، کسی کی جان مال اور عزت محفوظ نہ تھی۔ اکابرِ قریش میں سے خاصی تعداد تو حج کے لیے مکہ معظمہ گئی ہوئی تھی،

بقیہ اپنی آواز کو بے اثر دیکھ کر اپنے گھروں میں بیٹھ گئے۔ حضرت علی نے بھی جب دیکھا کہ معاملہ ان کے قابو سے باہر ہے تو وہ مدینہ منورہ سے باہر مقامِ احجار الزیت چلے گئے۔

حضرت عثمان اس طوفانِ بدتمیزی کے باوجود بڑی بہادری اور جرأت کے ساتھ نمازیں پڑھانے کے لیے مسجد نبوی آتے رہے۔

مگر ایک جمعہ کو وہ منبرِ مسجد پر خطبہ دے رہے تھے کہ ایک مفسد جہاہ نے ان کو ہاتھ پکڑ کر منبر سے اتار دیا اور آپ کے ہاتھ سے وہ عصا چھین لی جس پر سہارا لگا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، پھر حضرت ابوبکر و حضرت عمر خطبہ دیا کرتے تھے۔ پھر اس ظالم نے اس عصا کو اپنے گھٹنے پر رکھ کر توڑ دیا۔ مگر اللہ نے اس ظالم کو یہ سزا دی کہ اس کے گھٹنے میں اس عصا کے کچھ ریزے گھس گئے اور وہاں زخم ہو گیا جس میں کیڑے پڑ گئے اور اسی تکلیف میں وہ مر گیا۔[1] کسی ظالم نے آپ کو زخمی بھی کر دیا۔ اور آپ بے ہوش ہو گئے۔ اس واقعہ کے بعد، ہمدردوں کے مشورہ سے حضرت عثمان نے مسجدِ نبوی میں آنا چھوڑ دیا۔[2]

گھر کا محاصرہ

اس واقعہ کے بعد، مفسدین کو اور جرأت ہوئی، اور انھوں نے حضرت عثمان کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ چالیس روز تک جاری رہا۔ اس دوران میں کوئی کھانے پینے کی چیز ان کے پاس نہ پہنچ سکتی تھی۔ حتیٰ کہ ایک روز حضرت ام حبیبہ، زوجۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے پینے کا سامان لے کر حضرت عثمان کے گھر پہنچانے کی کوشش کی۔ مگر ان ظالم مفسدوں نے ان کا بھی احترام نہ کیا اور ان کے ساتھ بھی بے ادبی کے ساتھ پیش آئے۔ آخر وہ بھی ناکام واپس آ گئیں۔

حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر، جن کو یہ مفسد بھی بڑا مانتے تھے،

---

[1] البدایہ والنہایہ لابن کثیر ج ۷، ص ۱۷۹ / ص ۱۷۵

اور ان کے نام پر ہی فریب کاری کے ساتھ انھوں نے اس سازش کا جال بُنا تھا، اُن کی اِن حرکتوں سے سخت بیزار تھے۔ مگر یہ اب ان کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ آخر مجبور ہو کر یہ اپنے اپنے گھروں میں خانہ نشین ہو گئے۔

تاہم انھوں نے اپنے فرزندوں کو، ان کی مدد اور حفاظت کے لیے ان کے گھر بھیج دیا۔ حضرت عثمان کا مکان وسیع تھا۔ اس میں سات سو جاں نثار موجود تھے، جن میں حضرت حسن و حضرت حسین، محمد بن طلحہ، عبداللہ بن زبیر، سعید بن عاص حضرت ابو ہریرہ شامل تھے۔

ان صاحبان کی کئی مرتبہ مفسدین سے جو بزورِ مکان میں داخل ہونا چاہتے تھے، جھڑپیں بھی ہوئیں۔ مگر انھوں نے ان کو اندر داخل نہ ہونے دیا۔

محاصرہ کے دوران آپ بالاخانہ پر کھڑے ہو کر، مفسدین کو مخاطب کر کے بارہا ولولہ انگیز تقریریں بھی کیں، اور ان میں اپنی اسلامی خدمات کا ذکر کیا اور ظالموں کو فہمائش اور ان کو اپنے ناپاک اِرادوں سے باز آنے کی تلقین کی مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ایک تقریر میں آپ نے فرمایا:

"میں قسم دے کر کہتا ہوں، کیا تم کو معلوم نہیں کہ ابتدائے اسلام میں جب مسجدِ نبوی، جو بہت مختصر تھی، تنگ ہونے لگی تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کون اللہ کا نیک بندہ ہے جو اپنے مال سے زمین خرید کر اس میں اضافہ کر دے تو اسے جنت میں اس سے بہتر جگہ ملے۔ تو میں نے اپنے خالص مال میں سے زمین خرید کر مسجد کو وسیع کر دیا۔ افسوس کہ آج تم مجھے اس مسجد میں نماز ادا کرنے سے بھی روکتے ہو۔

میں تم کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں، کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہاں بئرِ رومہ کے سوا کوئی اور میٹھے پانی کا کنواں نہ تھا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کون اللہ کا نیک بندہ اسے خرید کر عام مسلمانوں کے لیے وقف کرتا ہے تاکہ اسے اس سے بہتر پانی کا

چشمہ جنت میں ملے، تو میں نے اسے اپنے ذاتی مال سے خرید کر وقف کیا۔ افسوس ہے کہ آج تم اس میں سے مجھے ایک قطرہ پانی نہیں پینے دیتے۔"

پھر آپ نے کہا: کیا تم کو معلوم نہیں کہ تبوک کے غزوہ میں جب مسلمانوں میں پیسہ کی تنگی تھی تو میں نے ایک ہزار کے لشکر کا انتظام اپنے ذمہ لیا تھا؟ سب نے کہا: ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔

ایک روز تقریر فرمائی:

لوگو، کیا تم کو یاد ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حرار پہاڑ پر چڑھے تو پہاڑ لرزنے لگا۔ آپ نے پہاڑ پر ٹھوکر مار کر فرمایا، اے حرار ٹھہر جا! تیرے اوپر ایک نبی اور ایک صدیق اور ایک شہید ہے، میں اس وقت آپ کے ساتھ تھا؟ لوگوں نے کہا، یہ تو ہمیں بھی یاد ہے۔

پھر فرمایا، میں تم کو قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ وہ کون ہے جسے حدیبیہ کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سفیر بنا کر مکہ بھیجا۔ پھر حضورؐ نے مسلمانوں سے موت کی بیعت لی، تو اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر مار کر کہا، یہ عثمان کا ہاتھ ہے۔ اور میری طرف سے اس طرح بیعت لی کہ اپنے ہاتھ کو میرا ہاتھ قرار دیا؟ لوگوں نے کہا بے شک یہ بھی صحیح ہے۔

ایک تقریر میں فرمایا:

لوگو! تم مجھے کیوں قتل کرتے ہو؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ کسی مسلمان کا خون صرف تین وجہ سے جائز ہے: جو شخص شادی شدہ ہو کر زنا کرے، یا کسی کو عمداً قتل کرے یا اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہو جائے۔ تو قسم ہے خدا کی میں نے جاہلیت میں بھی زنا نہیں کیا، نہ میں نے کسی کو قتل کیا ہے نہ خدانخواستہ میں مرتد ہوا ہوں۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

لہ البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۱۷۸ / ص ۱۷۹۔

مگر ان بد باطن اور بد طینت مُفسدوں پر کسی بات کا اثر نہ ہوا، بلکہ آپ کے قتل کی تدبیریں سوچنے لگے۔

شہادت سے ایک روز پہلے جو جاں نثار آپ کی حفاظت کے لیے موجود تھے انھوں نے حضرت عثمان سے موقعہ کی نزاکت کا ذکر کرکے کہا، آپ ہم کو اجازت دیں کہ اپنی تلواروں کے جوہر دکھائیں اور ان مُفسدوں کو مار بھگائیں۔

مگر آپ نے فرمایا؛

میں تم کو قسم دے کر کہتا ہوں اور اس حق کا حوالہ دے کر کہتا ہوں جو میرا تم پر ہے کہ تم میں سے ہر شخص اپنے ہاتھوں کو روکے رکھے، بلکہ اپنے گھر چلا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت عثمان کو اپنی شہادت کا یقین تھا اور وہ راہِ حق میں مظلومانہ اپنی جان دینے کو پسند کرتے تھے۔ اور کسی طرح مسلمانوں کا خون بہانے کے روادار نہ تھے۔

شہادت کی تیاری

اگلے روز جمعہ کا دن تھا۔ آپ روزہ سے تھے، آپ نے خواب میں دیکھا کہ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر تشریف رکھتے ہیں اور ان سے مخاطب ہوکر کہہ رہے ہیں، اے عثمان جلدی کرو، ہم افطار کے لیے تمہارے منتظر ہیں۔ بیدار ہوئے تو آپ نے اپنی اہلیہ محترمہ نائلہ سے اس کا ذکر کیا اور فرمایا کہ میری شہادت کا وقت آگیا ہے۔ انھوں نے کہا؛ امیرالمومنین یہ خواب کی بات ہے، ایسا نہیں ہو سکتا۔ مگر آپ نے فرمایا؛ نہیں یہ بشارت ہے، ایسا ضرور ہوگا۔

پھر، آپ نے اپنے بیس غلاموں کو آزاد کیا۔ اور پائجامہ، جو پہلے کبھی نہ پہنا تھا، منگا کر اس لیے پہنا تاکہ ستر نہ کھلنے پائے۔ اور تلاوتِ قرآن میں مشغول ہوگئے۔

شہادت

۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو جمعہ کا دن تھا۔ مفسدوں کو اندیشہ تھا کہ اب مکہ معظمہ کو حج کے لیے جانے والے واپس آجائیں گے۔ اور ممکن ہے کہ شام سے حضرت معاویہ، بصرہ سے ابن عامر اور مصر سے عبداللہ بن ابی سرح اپنی

فوجیں بھیج دیں تو پھر ان کا مقابلہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے انھوں نے اپنے ظالمانہ ارادہ کو پورا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اب بھی، ان کو یہ جرأت تو نہ ہوئی کہ صدر دروازہ پر آکر حضرت عثمانؓ کے جاں نثاروں سے مردانہ وار مقابلہ کریں۔

چار شخص مکان کی پچھلی دیوار پھاند کر بالاخانہ پر چڑھ گئے، جہاں حضرت عثمان غنی، اطمینان کے ساتھ قرآنِ کریم سامنے رکھے ہوئے اس کی تلاوت فرما رہے تھے۔

پہلے محمد بن ابو بکر، جو حضرت علی کے پروردہ تھے اور حضرت عثمان سے اس لیے ناراض تھے کہ انھوں نے ایک معاملہ میں اُن کے خلاف ڈگری دے دی تھی، آگے بڑھے۔ حضرت عثمان نے فرمایا، بھتیجے! اگر آج تمہارے باپ ابو بکر زندہ ہوتے تو کبھی تمہاری اس حرکت کو پسند نہ کرتے۔ یہ سن کر محمد بن ابو بکر شرمندہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے اور اپنا منہ ڈھک لیا۔ ان کے بعد کنانہ بن بشر ظالم نے، آپ کی پیشانی پر لوہے کا ایک گرز مارا۔ آپ کا چہرہ لہولہان ہو گیا اور پیشانی کے بل زمین پر گر گئے۔ اس کے بعد سودان بن حمران مرادی نے تلوار کا وار کیا۔ آخر میں عمرو بن الحمق آپ کے سینۂ مبارک پر چڑھ بیٹھا اور نیزہ کے نو وار کیے، جس سے آپ نے دم توڑ دیا اور روحِ مبارک جنت الفردوس کو پرواز کر گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ[1]

وفادار بیوی نائلہ نے اپنے مقدس شوہر کی مدافعت کے لیے ہاتھ بڑھایا، اُن کے ہاتھ کی انگلیاں اُڑ گئیں۔

چونکہ قرآنِ کریم حضرت عثمانِ شہید کے سامنے کھلا رکھا تھا اس لیے خون کے قطرے اس آیۂ مبارکہ پر گرے۔

فَسَیَکْفِیْکَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ — تمہارے لیے، ان کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کافی ہوگا اور وہ سب جانتا ہے اور بڑی حکمت والا ہے

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۱۸۵

تدفین حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد مفسدوں نے کاشانۂ خلافت کو لوٹا۔ پھر بیت المال پر ہاتھ صاف کیا۔ سارے مدینہ میں خوف و ہراس کا عالم طاری تھا۔ کسی کی جان اور آبرو محفوظ نہ تھی۔ لوگ اپنی عزت بچانے کے لیے گھروں میں دروازے بند کر کے بیٹھ گئے۔ خلیفۃ المسلمین کی لاش تین روز تک بے گور و کفن پڑی رہی۔ ان ظالموں کے ڈر سے کسی کو دفن کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

آخر جرأت کر کے، حکیم بن حزام قریشی اور جبیر بن مطعم بن عدی وغیرہ چند بزرگ حضرت علی کے پاس پہنچے اور ان سے درخواست کی کہ وہ اپنے زیرِ اثر لوگوں سے کہہ کر خلیفۃ المسلمین کی تدفین کا انتظام کرا دیں۔

حضرت علی نے کچھ لوگوں کو اس کام کے لیے مقرر کیا۔ ان کی نگرانی میں مغرب کے بعد، مراکش سے بلوچستان تک کے حکمراں کو کل سترہ آدمی دفن کے لیے لے کر نکلے مگر مفسدین کو یہ بھی گوارا نہ ہوا۔ ظالموں نے ان کے جنازہ پر پتھر برسائے۔ حضرت علی کو خبر دی گئی تو ان کی فہمائش پر باز آئے۔ نمازِ جنازہ جبیر بن مطعم نے پڑھائی اور حضرت عثمان کو جنت البقیع کے قریب حش کوکب میں دفن کیا گیا۔ بعد میں حضرت معاویہ کے عہدِ حکومت میں اس جگہ کو جنت البقیع سے ملا دیا گیا۔[1]

غم کے آنسو حضرت عثمان جیسے نیک دل اور امن پسند خلیفہ کے اس مظلومانہ اور سفاکانہ قتل پر، سیاہ دل مفسدوں کے سوا، کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو خوں فشاں نہ ہو، اور کوئی زبان ایسی نہ تھی جو نوحہ خواں نہ ہو۔

حضرت عائشہ کو شہادت کی خبر ملی تو فرمایا، ظالموں نے ان کو شہید کر دیا۔ خدا کی قسم وہ عزیزوں سے سب سے زیادہ بھلا برتاؤ کرنے والے اور اپنے پروردگار

---

[1] تاریخ طبری ج ۵ ص ۱۷۳

سے سب سے زیادہ ڈرنے والے تھے۔ ان دس لوگوں میں سے ایک تھے جن کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جنت کی خوشخبری دی تھی۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم تادمِ آخر ان سے راضی رہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا: اللہ ابو عمرو پر رحم کرے۔ خدا کی قسم وہ سب سے زیادہ فیاض اور نکوکار تھے۔ تہجد کے وقت اپنے رب کے سامنے گریاں اور آخرت کے خوف سے لرزاں و ترساں رہتے تھے۔ جیشِ عسرت کے ہیرو، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد تھے۔ جو لوگ ان کو بُرا کہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان پر قیامت تک لعنت بھیجے۔

حضرت عبداللہ بن سلام نے کہا، افسوس آج عرب کی قوت کا خاتمہ ہو گیا۔

حضرت حذیفہ نے، جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے محرمِ اسرار تھے، فرمایا: افسوس عثمان کے قتل سے اسلام میں وہ رخنہ پڑ گیا جو اب قیامت تک بند نہ ہوگا۔

نتائجِ بد حضرت حذیفہ کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا افسوسناک نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کا شیرازہ بکھر گیا اور ان کی جمعیت پارہ پارہ ہو گئی۔ اس حادثہ کے بعد فرزندانِ اسلام، جو دشمنوں کے مقابلہ میں سدِّ سکندری بنے ہوئے تھے، مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ بڑے بڑے گروہ یہ ہیں:

شیعۂ علی: یہ وہ لوگ تھے جو خود کو حضرت علی کا مددگار قرار دیتے تھے اور حضرت عثمان ہی کو نہیں بلکہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو بھی خلیفہ نہیں مانتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بحکمِ خداوندی حجۃ الوداع سے واپسی میں، حضرت علی کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ ان کے بعد، ان کی اولاد میں گیارہ اماموں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخری امام محمد بن حسن عسکری المہدی، "سُرَّ مَنْ رَاٰی" کے ایک غار میں روپوش ہو گئے۔ وہ آخری زمانہ میں برآمد ہوں گے اور دنیا کو ایمان و انصاف سے بھر دیں گے۔

ان کے خیال میں امام کا تقرر اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو انتخاب کا حق نہیں ہے۔ یہ لوگ امامیہ یا اثنا عشریہ کہلاتے ہیں۔ ان میں بھی متعدد فرقے ہیں۔ زیدیہ، حضرت ابوبکر و عمر کو خلیفہ تسلیم کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کے خیال میں مسلمانوں کو ان کے انتخاب میں چوک ہوئی۔ سب سے زیادہ متشدد فرقہ سبائیہ ہے، جو حضرت علی کو مظہرِ خدا سمجھتے ہیں۔[1]

خوارج ان ہی میں سے ایک جماعت خوارج کے نام سے پیدا ہوئی۔ پہلے یہ لوگ حضرت علی کے ساتھی تھے۔ جنگِ صفین (جو حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان ہوئی) کے موقعہ پر، پہلے تو انھوں نے حضرت علی کو، حضرت معاویہ سے مُصالحت پر مجبور کیا۔ بعد میں اسی بنیاد پر ان کو بُرا کہنے لگے کہ انھوں نے ایک باغی سے صلح کیوں کی۔ یہ حضرت علی اور ان کے حریفوں دونوں کو کافر کہتے تھے۔

شیعۂ عثمان یہ وہ لوگ تھے جو حضرت عثمان کے قاتلوں اور ان کے مددگاروں کو باطل پر سمجھتے تھے۔ حضرت علی کو بھی خلیفہ نہیں مانتے تھے۔ کیونکہ ان کے خیال میں ان کا انتخاب اتفاقِ رائے سے نہیں ہوا۔ پھر اس لیے بھی کہ انھوں نے حضرت عثمان کے قاتلوں سے قصاص نہیں لیا۔ اس جماعت میں زیادہ تر بنی امیہ کے خاندان کے لوگ تھے۔

اہلِ سنت والجماعت یہ وہ لوگ تھے جو چاروں خلفاءِ راشدین کو برحق اور ان کے انتخاب کو اصولِ شوریٰ کے مطابق صحیح سمجھتے تھے۔ ان کے باہمی اختلاف کو اجتہادی اور رائے کا اختلاف سمجھتے تھے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے دین کے راستہ کو اپنایا اور جماعتِ صحابہ و تابعین کے مسلک کو اختیار کیا۔ اسی لیے اہلِ سنت والجماعت کہلائے۔

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۱۷۲ مطبوعہ مصر۔

عالمِ اسلام میں یہی جماعت بہت بڑی اکثریت میں ہے۔

امتِ مسلمہ کے اس اختلاف و انتشار کے علاوہ دوسرا افسوسناک نتیجہ حضرت عثمان کی شہادت کا یہ ہوا کہ اب تک مسلمانوں کے سربراہ اور خلیفہ کا انتخاب قرآنِ کریم کے حکم وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (ان کے آپس کے معاملات باہم مشورہ سے طے ہوتے ہیں) کے مطابق رائے عامہ سے ہوتا تھا۔ اب وہ زور و قوت سے ہونے لگا۔ اور اسلام کا شورائی نظام جس کے سہارے اسلام کا نظامِ زندگی قائم تھا، درہم برہم ہوگیا۔

خاندانِ عثمانِ غنیؓ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کئی نکاح کیے۔

۱ پہلی زوجۂ محترمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت رقیہ تھیں۔ انھوں نے ۵ نبوی میں حضرت عثمان کے ساتھ ملکِ حبش ہجرت کی۔ پھر وہاں سے واپس آ کر مدینہ منورہ کی ہجرت میں شریک رہیں۔ ۲ھ میں غزوۂ بدر کے موقعہ پر وفات پائی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی کی تیمارداری کے لیے حضرت عثمان کو مدینہ منورہ میں چھوڑ دیا تھا۔ ان سے ایک فرزند عبداللہ پیدا ہوئے۔

۲ ان کے بعد، ۳ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چھوٹی صاحبزادی حضرت اُمِّ کلثوم سے ان کا نکاح کر دیا۔ اسی لیے حضرت عثمان ذوالنورین (دو نوروں والے) کہلائے۔ انھوں نے بھی ۹ھ میں وفات پائی۔ ان سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔

ان کے علاوہ دوسری اِن بیویوں سے حضرت عثمان نے شادیاں کیں:

۳ فاختہ بنت غزوان، ان سے ایک فرزند عبداللہ اصغر پیدا ہوئے۔

۴ اُمِّ عمرو بنت جندب، ان سے عمر، خالد، ابان اور مریم پیدا ہوئے۔

۵ فاطمہ بنت ولید، ان سے ولید اور سعید یا ام سعید پیدا ہوئے۔

۶ ام البنین بنت عیینہ، ان سے عبدالملک اور عتبہ پیدا ہوئے۔

۷ رملہ بنت شیبہ، ان سے عائشہ، ام ابان اور ام عمرو پیدا ہوئیں۔

۸ نائلہ بنت فرافصہ، یہ قبیلۂ بنی کلب سے تعلق رکھتی تھیں، عیسائی تھیں، اسلام قبول کر لیا تھا۔ حضرت عثمان کی محصوری کے زمانہ میں ان کی رفیق اور محافظ رہیں، ان سے مریم پیدا ہوئیں۔

نائلہ کے علاوہ حضرت عثمان کی شہادت کے وقت ان کے ساتھ رملہ بنت شیبہ ام البنین بنت عیینہ، فاختہ بنت غزوان بھی تھیں۔[۱]

---

[۱] تاریخ طبری ج ۵ ص ۱۴۸

عہدِ خلافت کے کارناموں پر ایک نظر

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو، اپنے پیش رَو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے جانشین کی حیثیت سے ایک وسیع و عریض حکومت کی ذمہ داریوں کا بار اٹھانا پڑا تھا۔ اس حکومت کی حدود ایک طرف مدینہ منورہ سے خراسان و سندھ تک، دوسری طرف سمرقند و بخارا تک، تیسری طرف شام و فلسطین تک اور چوتھی طرف مصر و افریقیہ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اگرچہ حضرت عمر مفتوحہ علاقوں کے تحفظ و نگرانی کا انتظام بھی ساتھ ساتھ کرتے رہتے تھے، مگر مفتوحہ اقوام کے سردار بھی جن کے بزرگوں کی شاندار تاریخ تھی، خاموش نہ بیٹھتے تھے۔ اور اپنی گردن سے محکومی کا طوق اتار دینے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ اس لیے حضرت فاروق کی آنکھ بند ہوتے ہی بغاوتوں کا بند کھل گیا۔ اور حضرت عثمان کے عہدِ حکومت کا اہم کام اِن بغاوتوں کا دبانا اور شورشوں کو فرو کرنا رہا۔ خلافت کے چھ سال بعد تو مسلمانوں میں اندرونی اختلافات کی وہ چنگاریاں بھڑکیں جنھوں نے عالمِ اسلامی کے امن و امان ہی کو بھسم کر دیا اور خود خلیفۂ اسلام کو اپنی جان کی قربانی دینی پڑی۔

پھر بھی حضرت عثمان کے زمانہ میں مجاہدینِ اسلام کے قدم کئی ملکوں میں آگے بڑھے اور نئے ملک اسلام کے پرچم کے سایے میں آئے۔

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ آپ کے عہد میں افریقیہ میں طرابلس کو فتح کیا گیا

اور تونس، الجزائر و مراکش کے وسیع علاقوں پر وہاں کی وحشی اور جنگ جُو قوموں کو زیر کر کے اسلام کا جھنڈا لہرایا گیا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ افریقیہ کی فتح کے بعد حضرت عثمان نے لشکرِ اسلام کو اسپین پر حملہ کرنے کا بھی حکم دیا۔ مسلمان نو میل چوڑی سمندر کی پٹی کو عبور کر کے اسپین میں داخل ہوئے اور وہاں کے حالات کا جائزہ لے کر واپس آگئے۔ مستقل فتح عہدِ ولید اموی میں ۹۲ھ میں ہوئی۔

حضرت عثمان کے عہد کا ایک بڑا کارنامہ بحری مُہمّات ہیں۔ حضرت عمر فاروق مسلمان مجاہدین کو سمندر پار کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ مگر حضرت عثمان نے حضرت معاویہ کو اس کی اجازت دی اور انھوں نے زبردست جنگی بیڑہ بنایا۔ عبداللہ بن قیس حارثی کو امیر البحر مقرر کیا اور مسلمانوں نے بحرِ روم کا سینہ چاک کر کے جزیرۂ قبرص کو فتح کر لیا۔ یہی بیڑہ، بحرِ روم میں شام و مصر کے ساحلوں پر رومیوں کے دانت کھٹے کرتا رہا۔ اس طرح رومیوں کی بحری طاقت کی برتری، جس پر انھیں ناز تھا، ختم ہو گئی۔

حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہد میں جو حیرت انگیز فوجی انتظامات کیے تھے، حضرت عثمان نے ان کو مزید مستحکم بنایا اور ترقی دی۔ فوجی محکمہ کو انتظامی محکمہ سے الگ کر دیا۔ فوجیوں کے وظائف میں ایک ایک سو درہم کا اضافہ کیا اور فوج کا نظام ایسا مربوط اور مضبوط کیا کہ جملہ ممالکِ محروسہ کی فوج زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے مُنسلک ہو گئی۔ امیر معاویہ کو رومیوں کے مقابلہ میں مدد کی ضرورت ہوئی تو ایران اور آرمینیہ کی فوجیں بعجلت مدد کے لیے پہنچ گئیں۔ عبداللہ بن ابی سرح کو طرابلس میں بغاوت کا سامنا کرنا پڑا تو شام و عراق کے مجاہدین برق رفتاری کے ساتھ ان کی اعانت کے لیے پہنچ گئے۔ افریقیہ کی فتح میں ضرورت پیش آئی تو مدینہ منورہ سے اکابرِ صحابہ کی سالاری میں امدادی فوجیں پہنچ گئیں۔

طرابلس، آرمینیہ، طبرستان اور قبرص میں فوجی چھاؤنیاں قائم کی گئیں۔ چھاؤنیوں کے ساتھ فوج کے گھوڑوں اور مویشیوں کے لیے جا بجا سرکاری چراگاہیں قائم کی گئیں سب سے بڑی چراگاہ مدینہ منورہ کے قریب ربذہ کے مقام میں تھی جو دس میل مربع تھی۔

حضرت عمرؓ کے عہد میں مسجد الحرام میں اضافہ کیا گیا تھا۔ عہدِ عثمانی میں اس میں اور مسجدِ نبوی میں مزید اضافے کیے گئے۔ مدینہ اور کوفہ میں مسافروں کے لیے مہمان خانے قائم ہوئے اور نئی سڑکیں اور پُل بنائے گئے۔

حفاظتِ قرآنِ کریم کا انتظام

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ایک اہم دینی کارنامہ قرآنِ کریم کی حفاظت و اشاعت کا انتظام ہے۔

قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب اور اسلام کا بنیادی قانون ہے۔ یہ کتابی شکل میں ایک دم نہیں اترا بلکہ اس کی آیتیں اور سورتیں حسبِ ضرورت و حالات مختلف اوقات میں اُترتی رہیں۔ اور اس طرح اسلامی زندگی کی تشکیلِ جدید ہوتی رہی۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے وہ مکمل ہو چکا تھا اور اس کی آیتوں اور سورتوں کی ترتیب بھی عمل میں آچکی تھی۔ جب کوئی آیت یا سورہ اُترتی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم بتا دیتے کہ اسے فلاں جگہ رکھا جائے۔ اس طرح آپ کی وفات سے پہلے قرآنِ مجید مُرتّب صورت میں مکمل ہو چکا تھا۔ کئی صحابۂ کرام کو پورا حفظ تھا۔ اور خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری رمضان میں دو بار پورے قرآنِ مجید کو حضرت جبریلؑ کے سامنے دُہرایا تھا۔

مگر قرآنِ کریم آپ کے زمانہ میں کتابی شکل میں ایک جگہ لکھا ہوا نہ تھا، بلکہ صحابۂ کرام اس کے مختلف اجزا کو ہڈیوں، چمڑوں اور مختلف قسم کے ورقوں پر لکھ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں سورہ بیّنہ میں فرمایا گیا:

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۙ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۭ

(اسلام کی حقانیت کی روشن دلیل) اللہ کا ایک رسول ہے جو مقدس اوراق کی تلاوت کرتا ہے، جن میں پختہ مضامین ہیں۔

صُحُف "صحیفہ" کی جمع ہے۔ صحیفہ پھیلی ہوئی چیز کو کہتے ہیں۔ یہاں ورق مراد ہے (امام راغب اصفہانی)۔ کُتُب "قیمۃ" سے صحیح اور پختہ مضامین مراد ہیں (بیضاوی)

حضرت ابوبکر کے زمانۂ خلافت میں جب یمامہ کی لڑائی میں ستر حفّاظِ قرآن شہید ہوئے تو حضرت عمر کے توجہ دلانے پر، حضرت ابوبکر نے ان مختلف اجزاء کو حضرت زید بن ثابت اور دوسرے صحابہ سے نہایت تلاش اور احتیاط کے ساتھ ایک جگہ مُصحَف کی شکل میں جمع کرادیا مُصحَف کتاب کو کہتے ہیں جس میں بہت سے صحیفے جمع کردیے گئے ہوں۔ (امام راغب)

یہ مُصحَف یا مُرتّب قرآن کریم حضرت ابوبکر کی زندگی میں آپ کی حفاظت میں رہا۔ پھر آپ کے بعد حضرت عمر فاروق کی نگرانی اور حفاظت میں رہا۔ حضرت عمر نے وفات کے قریب ام المومنین حضرت حفصہ کے حوالہ کردیا۔

حضرت عثمان کے زمانہ میں جب دور دراز کے ملکوں میں اسلام کی روشنی پہنچی اور مختلف قوموں اور ملکوں کے لوگوں نے، اپنے اپنے لہجوں میں قرآنِ کریم پڑھنا شروع کیا تو ان میں اختلافِ قرأت نمودار ہوا۔ اہلِ مصر کا لہجہ کچھ تھا، اہلِ خراسان کا کچھ اور اہلِ شام کا کچھ۔ حضرت حذیفہ نے یہ منظر دیکھا تو انھیں بڑی فکر ہوئی کہ کہیں توریت و انجیل کی طرح قرآن میں بھی اختلاف نہ ہوجائے، انھوں نے مدینہ منورہ جاکر حضرت عثمان سے اپنا اندیشہ بیان کیا۔ حضرت عثمان نے صحابۂ کرام کو جمع کرکے مشورہ کیا۔ سب کی رائے سے حضرت ابوبکر کے زمانہ کا قرآن کا نسخہ، جو حضرت حفصہ رضؓ کے پاس محفوظ تھا، منگایا گیا اور اس کی متعدد نقلیں کراکر مختلف مفتوحہ ملکوں میں ایک ایک نسخہ بھجوادیا گیا اور حکم دیا گیا کہ ہر جگہ تلاوت و کتابت اِسی مُستند صحیح نسخہ کے مطابق ہو، جو قریش کے لہجہ میں تھا۔ اس طرح قرآنِ کریم ہر قسم کے اختلاف اور تحریف کے امکان سے محفوظ ہوگیا۔

ان نسخوں میں سے ایک نسخہ آج بھی روسی علاقہ کے ایک کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

مگر افسوس کہ حضرت عثمان صرف ۶ سال امن و اطمینان کے ساتھ حکمرانی کے فرائض انجام دے سکے۔ آخر بیرونی اور اندرونی مخالفوں کی سازشوں سے فتنہ و فساد کا ہولناک طوفان اٹھا، جس کا تذکرہ پہلے تفصیل سے آچکا ہے اور اس کے نتیجہ میں مرکزِ خلافت مدینہ منورہ میں، روزِ روشن میں، ان کو راہِ حق میں اپنی جان کی قربانی پیش کرنی پڑی۔ رَحِمَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی رَحْمَۃً شَامِلَۃً کَامِلَۃً۔

عہدِ خلافتِ مرتضوی

انتخابِ خلافت

حضرت عثمان کی شہادت کے بعد مدینہ منورہ میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اہلِ مدینہ میں سے بڑی تعداد فوجی و انتظامی فرائض کی ادائگی کے لیے دور دراز علاقوں میں منتشر تھی۔ کچھ حج ادا کرنے کے لیے مکہ معظمہ گئے ہوئے تھے، اور جو مدینہ منورہ میں موجود تھے وہ بھی اس فتنہ سے بچنے کے لیے خانہ نشین ہو گئے تھے۔ مدینہ منورہ پر عملاً آفاقیوں (بصرہ، کوفہ اور مصر کے مفسدین) کا قبضہ تھا۔ تین دن تک مسندِ خلافت خالی پڑی رہی۔ قاتلینِ عثمان کا سرغنہ غافقی بن حرب مسجدِ نبوی میں امامت کرتا رہا۔

مفسدین نے سوچا کہ اگر ہم یہاں سے چلے گئے اور کوئی شخص ایسا منتخب ہو گیا جسے ہماری تائید حاصل نہ ہو تو وہ ہم کو قصاص میں قتل کرا دے گا۔ اس لیے یہ کام ہمارے ہاتھوں مکمل ہو جانا چاہیے۔ ان میں بھی اختلافِ رائے تھا۔ کوفی حضرت زبیر کو، بصری حضرت طلحہ کو، مصری حضرت علی کو چاہتے تھے مگر ان تینوں نے انکار کر دیا۔ ان سے کورا جواب پاکر یہ لوگ حضرت سعد بن وقاص اور حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس پہنچے۔ یہ بھی آمادہ نہ ہوئے۔

آخر پھر حضرت علی کے پاس پہنچے اور ان پر دباؤ ڈالا۔ اہلِ مدینہ میں سے بھی اکثر کی رائے یہی ہوئی کہ حضرت علی قبول فرمالیں تاکہ شورش ختم ہو۔ مجبوراً انھوں نے یہ ذمہ داری قبول فرمالی۔

۲۵ ذی الحجہ ۳۵ھ کو جمعہ کے دن آپ نے مسجدِ نبوی میں بیعت لی۔ جس میں اہلِ مدینہ اور اکثر آفاقی شریک ہوئے۔

بیعت کے بعد آپ نے پُرزور خطبہ دیا، جس میں مسلمانوں کو قرآنِ کریم کی تعلیمات پر عمل کرنے، آپس میں اتحاد و اتفاق قائم کرنے، شر و فساد سے بچنے، ایک دوسرے کی جان، مال اور عزت و آبرو کا احترام کرنے کی تلقین کی۔

مگر اس بیعت میں حضرت عثمان کے اہلِ خاندان بنو امیہ کے لوگ شریک نہ ہوئے وہ ملکِ شام کی طرف نکل گئے، جہاں کے گورنر، حضرت عثمان بن عفان کے چچا زاد بھائی حضرت معاویہ بن ابی سفیان تھے۔ ان کے علاوہ بعض اکابر صحابہ نے بھی بیعت نہ کی۔ ان میں حضرت عبداللہ بن عمر، حسان بن ثابت، کعب بن مالک، مسلمہ بن مخلد، ابو سعید خدری، محمد بن مسلمہ، نعمان بن بشیر، زید بن ثابت، رافع بن خدیج، فضالہ بن عبید اور کعب بن عجرہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ آفاقیوں کے تسلط سے مدینہ منورہ میں امن و امان مفقود ہے، اور موجودہ فضا میں آزادیٔ رائے سے خلیفہ کا انتخاب ممکن نہیں ہے۔ حضرت طلحہ نے جو عشرۂ مبشرہ میں سے تھے اور حضرت عمر کی انتخابی کمیٹی میں شامل تھے، پہلے کچھ تامل کیا، مگر مالک اشتر سر پر تلوار کھینچ کر کھڑا ہو گیا اور کہا اگر بیعت نہ کرو گے تو سر کے دو ٹکڑے کر دوں گا۔ مجبوراً انھوں نے بیعت کر لی۔ ان کے بعد حضرت زبیر نے بھی بیعت کر لی۔

حالاتِ قبلِ خلافت

نام علی، کُنیت ابو تُراب، لقب اسد اللہ۔ آپ کا سلسلۂ نسب یہ ہے:
علی بن ابی طالب بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محترم اور پیارے چچا حضرت ابو طالب کے فرزند تھے۔ آپ کی والدہ فاطمہ بنت اسد بن ہاشم بن عبد مناف تھیں۔ ابو طالب، خاندانِ قریش کے چشم و چراغ اور مکہ کے سردار تھے۔ رسولِ خدا محمد مصطفیٰ اپنے دادا عبد المطلب کے انتقال کے بعد ابو طالب ہی کی کفالت اور تربیت میں رہے۔ آپ نے ان کو بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ پالا۔ جب آپ منصبِ نبوت پر فائز ہوئے اور کفرستانِ مکہ میں اعلانِ حق کیا تو آپ کے خلاف مخالفتوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس طوفان میں جناب ابو طالب سدِّ سکندری بن کر کھڑے ہو گئے اور حضور کا بال بیکا نہ ہونے دیا۔

مگر افسوس ہے کہ حضور کی سخت خواہش اور کوشش کے باوجود انھوں نے اسلام قبول نہ کیا، اور جو شخص قریش کی قوت و طاقت سے نہ ڈرا وہ ان کے طعن و تشنیع کے خوف سے دولتِ ایمان سے محروم رہ گیا۔ جناب ابو طالب اپنی جاہ و حشمت کے باوجود مال و دولت سے محروم تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے مالی آسودگی عطا کی تو ایک سال مکہ معظمہ میں سخت قحط پڑا۔ حضور اور آپ کے دوسرے چچا عباس جناب ابو طالب کے پاس گئے اور ان سے کہہ سُن کر آپ نے حضرت علی کو اور حضرت عباس نے جعفر کو اپنی کفالت میں لے لیا اور اس طرح ابو طالب کا بوجھ ہلکا ہوا۔ اس وقت سے حضرت علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی اور کفالت میں رہتے تھے۔ اور حضور اور ان کی نیک بی بی حضرت خدیجہ رضؓ

ان کے ساتھ اپنے بچوں کا سا معاملہ کرتی تھیں۔

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم منصبِ نبوت پر فائز ہوئے اور غارِ حرا میں آپ پر پہلی وحی اُتری اور آپ نبوت کے بارِ گراں کو کندھے پر لیے ہوئے اپنے گھر آئے، تو سب سے پہلے اس دولت کو آپ کی پاک دل بیوی حضرت خدیجہؓ نے قبول کیا۔ حضرت علی کی عمر اس وقت دس سال کی تھی۔ آپ نے اپنے گھر کے دونوں بزرگوں کو دیکھا کہ وہ بارگاہِ خداوندی میں رکوع و سجود میں مصروف ہیں، تو آپ نے تعجب کے ساتھ پوچھا کہ آپ لوگ یہ کیا کر رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اپنی نبوت کی خبر دی اور اسلام قبول کرنے کی دعوت دی، تو آپ نے اپنے والد جناب ابوطالب سے اجازت لینے کی مُہلت لی اور اگلے روز اسلام قبول کر لیا۔ پھر اس وقت سے ساری عمر اسلام کے حامی و داعی رہے۔

محققین کی رائے ہے کہ عورتوں میں حضرت خدیجہ، مَردوں میں حضرت صِدّیقِ اکبر، بچوں میں حضرت علی اور غلاموں میں حضرت زید بن حارثہ (جو آپ کے گھر کے ہی آدمی تھے) رضی اللہ عنہم سب سے پہلے اسلام لائے۔ ہجرت کے دوسرے سال جب حضرت علی کی عمر ۲۱ سال اور حضرت فاطمہ کی پندرہ سال کی تھی تو حضور نے اپنی چہیتی بیٹی فاطمہ زہرا کا نکاح ان کے ساتھ کر دیا۔ مہر ۵۰۰ دِرم قرار پایا۔ اسی لیے یہ مہر، مہرِ فاطمی کہلاتا ہے۔ اس کی مقدار ۱۳۱ تولے ۳ ماشے چاندی ہوتی ہے[1] میاں بیوی کے تعلقات ساری عمر انتہائی خوشگوار رہے۔ جب تک حضرت فاطمہ زہرا زندہ رہیں آپ نے کوئی اور شادی نہ کی۔

نبوت کے چوتھے سال، نبیِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ:

اَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ اپنے قریبی عزیزوں کو (عذابِ خداوندی سے) ڈراؤ

تو حضور نے اہلِ خاندان کو کھانے پر بُلایا۔ اس دعوت کا انتظام حضرت علی نے

---

[1] جواہر الفقہ از مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ ص ۴۲۲

کیا۔ کھانے کے بعد حضور نے عزیزوں کے سامنے اسلام کی پیش کش کی مگر سب خاموش رہے۔ حضرت علی نے یہ منظر دیکھا تو کھڑے ہو کر کہا:

"اگرچہ میری آنکھیں دُکھ رہی ہیں، اگرچہ میری ٹانگیں کمزور ہیں، اگرچہ میں سب سے کم عمر ہوں۔ مگر اے بھائی میں آپ کا یار و مددگار رہوں گا۔"

اس طرح حضور کا غم ہلکا کیا۔

نبوت کے تقریباً تیرہ سال بعد، جب مکہ میں مسلمانوں کے لیے زمین تنگ کر دی گئی اور پیغمبرِ اسلام کی زندگی کی شمع کو گُل کر دینے کا انتظام کیا جانے لگا، تو باشارۂ خداوندی حضور نے مدینہ منورہ کو ہجرت کا فیصلہ کیا۔ یہ ارادہ سخت مخفی رکھا گیا۔ اس نازک موقعہ پر صرف دو شخصیتیں تھیں جو اس اہم اقدام کے منتظم اور معاون تھے: حضرت ابوبکر اور حضرت علی۔ حضرت علی کو آپ نے اپنے بستر پر لٹایا تاکہ دشمنوں کو آپ کی عدمِ موجودگی کا احساس نہ ہو اور آپ کے بعد وہ اہلِ مکہ کی امانتیں جو آپ کے پاس محفوظ تھیں، ان کے سپرد کر سکیں۔ کیونکہ یہ کام رواج کے مطابق خاندان کا ہی کوئی فرد انجام دے سکتا تھا۔ اور اپنے یارِ وفادار حضرت صدیقِ اکبر کو ساتھ لیا اور سفر کا سارا اہتمام ان کے اہلِ خانہ کے سپرد کیا۔

حضرت علی تمام غزوات میں، بجز غزوۂ تبوک کے، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے دست و بازو رہے۔

غزوۂ بدر میں جب کفارِ قریش نے اپنے ہم رُتبہ لوگوں کو مُبارزت کے لیے طلب کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی، حضرت حمزہ اور عبیدہ کو مقابلہ کے لیے بھیجا۔ حضرت علی نے اپنے حریف ولید کو ایک ہی وار میں قتل کر دیا۔ پھر عبیدہ کی بھی مدد کی اور ان کے حریف شیبہ کو بھی ٹھکانے لگایا۔ غزوۂ اُحد میں جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دندانِ مبارک شہید اور آپ کا چہرۂ مبارک زخمی ہوا تو حضرت فاطمہ نے زخم دھویا اور حضرت علی اپنی ڈھال میں پانی بھر بھر کر لاتے رہے۔ غزوۂ خندق میں جب عمرو بن عبدِوُد چند بہادروں کو لے کر خندق پار

کرنے کے لیے بڑھا، تو آپ نے آگے بڑھ کر اسے جہنم رسید کیا۔ اس کے بعد دوسرے کافر بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر صلح نامہ آپ ہی کے ہاتھ سے لکھا گیا۔ غزوۂ خیبر میں یہودی اپنے مضبوط قلعوں میں چھپ کر بیٹھ گئے تھے، ان کو مسخر کرنے میں دقت پیش آئی۔ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، کل میں ایسے شخص کے ہاتھ میں جھنڈا دوں گا جس کے محبوب اللہ اور اس کے رسول ہوں گے اور وہ اللہ اور اس کے رسول کا محبوب ہوگا۔ دوسرے صاحبان ساری رات منتظر رہے کہ دیکھیے یہ فخر کل کسے حاصل ہوتا ہے۔ صبح کو آپ نے حضرت علی کو بلایا۔ آپ نے عرض کیا کہ میری آنکھیں دُکھ رہی ہیں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی آنکھوں میں اپنا لعابِ دہن لگایا۔ ان کی یہ تکلیف فوراً جاتی رہی۔ پھر آپ نے ان کو اسلام کا جھنڈا عطا فرمایا۔ حضرت علی نے قلعہ کا دروازہ توڑ کر اسے فتح کیا اور یہودیوں کے سردار مرحب کو قتل کیا۔ اسی لیے آپ کو فاتحِ خیبر کہا جاتا ہے۔

فتحِ مکہ میں بھی افواجِ اسلامی کے علمبردار آپ ہی تھے۔ پھر جب خانہ کعبہ کو بتوں کی نجاست سے پاک کیا گیا تو پہلے رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کے کاندھوں پر چڑھ کر بُت گرائے۔ مگر جب وہ حضور کے جسم کا بوجھ نہ برداشت کر سکے تو حضور نے ان کو اپنے کاندھوں پر چڑھا کر باقی بُت گروائے۔

غزوۂ حنین میں بھی جب فتحِ مکہ کے نو مسلموں کی کمزوری کی وجہ سے مسلمانوں کے پاؤں اُکھڑ گئے تھے، آپ بھی دوسرے اکابر صحابہ کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ آپ نے لشکرِ کفار کے سردار کو قتل کر کے لڑائی کا پانسہ پلٹ دیا۔

غزوۂ تبوک میں آپ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ پر اپنا قائم مقام بنایا۔ اور آپ حضورؐ کے حکم کی تعمیل میں بادلِ ناخواستہ اس مہم میں شریک نہ ہو سکے۔

۹ھ میں مسلمانوں پر حج فرض ہوا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت

ابوبکر صدیق کو اپنا قائم مقام بنا کر مکہ معظمہ روانہ کیا اور آپ نے تین سو ساتھیوں کے ساتھ امیر الحج کے فرائض انجام دیے۔ حضرت ابوبکر کی روانگی کے بعد سورۂ برارۃ کی ابتدائی آیات اتریں۔ ان میں عرب کے غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کی نئی پالیسی کا اعلان کیا گیا تھا۔ حضور نے ان آیات کو سنانے کے لیے حضرت علی کو روانہ فرمایا۔ آپ نے حضرت ابوبکر کی امارت میں فرائضِ حج ادا کیے، پھر منیٰ میں سورۂ حج کی آیات پڑھ کر سنائیں اور ان کی تشریح کی۔ یہ کام عرب کے رواج کے مطابق حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا کوئی رشتہ دار ہی کر سکتا تھا۔

اگلے سال، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو یمن کے قبیلوں میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے روانہ کیا اور اپنے دستِ مبارک سے آپ کے سر پر عمامہ باندھا۔ آپ نے یمن پہنچ کر اسلام کی تعلیمات کی اشاعت کی اور بہت سے نئے قبیلے داخلِ اسلام ہوئے۔ پھر آپ وہاں سے آکر حجۃ الوداع کے موقع پر مکہ معظمہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے آملے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے موقع پر آپ اہلِ خانہ ہونے کی وجہ سے تجہیز و تکفین میں مصروف رہے اور سقیفۂ بنی ساعدہ کے جلسہ میں شریک نہ ہو سکے، مگر انھوں نے مسجدِ نبوی میں آکر حضرت ابوبکر صدیق کی بیعت کی۔ مگر پھر کچھ دنوں تک حضرت فاطمہ زہرا کی علالت کی وجہ سے مصروف رہے۔ اس سے بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی، اس لیے حضرت زہرا کی وفات کے بعد آپ نے تجدیدِ بیعت کی اور ساری عمر حضرت صدیقِ اکبر کے مشیرِ باتدبیر رہے۔

حضرت ابوبکر کے بعد، حضرت فاروقِ اعظم بھی اپنے زمانۂ خلافت میں ان کے مشوروں سے مستفید ہوتے رہے۔ جب آپ نے بیت المقدس کا سفر کیا تو حضرت علی ہی کو مدینہ منورہ میں اپنا جانشین نامزد فرمایا پھر وفات کے قریب آئندہ خلیفہ کے انتخاب کے لیے جو شش رکنی کمیٹی بنائی، اس کا رکن آپ کو

بھی بنایا۔

پھر حضرت عثمان کے زمانۂ خلافت میں بھی آپ ان کے مخلص مُشیر اور مددگار و معاون رہے۔ جب مفسدوں نے مدینہ منورہ پہنچ کر حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کیا تو آپ نے مفسدوں کو اس حرکت سے باز آنے کی فہمائش و کوشش کی۔ مگر جب نہ مانے تو غصّہ کے ساتھ اپنا عمامہ پھینک کر واپس چلے آئے۔ اور اپنے دونوں صاحبزادوں حضرت حسن و حضرت حسین کو، حضرت عثمان کی حفاظت اور مدد کے لیے ان کے گھر پر چھوڑ آئے۔

حضرت علی کو جب حضرت عثمان کی شہادت کی خبر ملی تو بے قرار ہو کر دوڑے ہوئے آئے۔ جو لوگ حضرت عثمان کی حفاظت پر مامور تھے، ان پر سخت برہمی کا اظہار کیا اور اپنے صاحبزادوں کے مُنہ پر طمانچہ بھی مارا اور روتے روتے حضرت عثمان کی لاش پر بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ لوگوں کو اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ بھی رُخصت نہ ہو جائیں۔[1]

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۱۹۳

واقعاتِ عہدِ خلافت

حضرت علی نے زمامِ خلافت ہاتھ میں لی تو دو اہم مسائل ان کے سامنے تھے۔ اول مسئلہ خلیفۂ شہید کے مظلومانہ قتل کے قصاص کا تھا، جس کی ذمہ داری ان پر بحیثیت خلیفہ کے عائد ہوتی تھی، اور جس کا مطالبہ مہاجرین و انصار کے اکابر خصوصاً حضرت عثمان کے عزیزوں اور ہمدردوں کی طرف سے کیا جا رہا تھا۔ مگر یہ معاملہ اس لیے پیچیدہ ہو گیا تھا کہ حضرت عثمان کے قتل کے وقت صرف ان کی بیوی نائلہ موجود تھیں۔ ان کا بیان تھا کہ محمد بن ابو بکر، جو حضرت علی کے ربیب تھے، دو شخصوں کے ساتھ دیوار پھاند کر گھسے اور حضرت عثمان کی طرف بڑھے۔ مگر انھوں نے جب ان کو شرمندہ کیا تو پیچھے ہٹ گئے۔ اور ان کے ساتھیوں نے، جن کو وہ نہیں جانتیں، حضرت عثمان کو شہید کیا۔ محمد بن ابو بکر نے بھی ان سے ناواقفیت کا اظہار کیا۔ بہر حال قاتل کا متعین کرنا مشکل ہو گیا تھا، اور اس سے زیادہ مشکل ان سے قصاص لینا تھا، کیوں کہ ان ہی کے جماعت کے لوگ حضرت علی کو گھیرے ہوئے تھے۔

معزولیِ حکّام

دوسرا مسئلہ صوبوں کے والیوں کے تقرر کا تھا۔ ہر خلیفہ کو حق تھا کہ وہ ایسے لوگوں کو صوبوں کی حکومت سپرد کرے جن کی کارکردگی پر اسے بھروسہ ہو اور وہ اس کے معتمد علیہ ہوں۔ مگر ابھی حضرت علی کی خلافت عالمِ اسلام میں تسلیم نہیں کی گئی تھی۔ خود ان والیوں نے بھی ابھی بیعت کی تکمیل نہ کی تھی۔ اسی لیے حضرت مغیرہ بن شعبہ اور حضرت عبداللہ بن عباس نے انھیں سمجھایا کہ ابھی وہ صوبوں کے حکّام کو تبدیل نہ کریں اور اپنی حکومت کے مستحکم ہونے کا انتظار کریں۔ مگر حضرت علی نے بلا تاخیر سب کی معزولی کے احکام

جاری کر دیے۔ بظاہر حضرت علی کے اس فیصلہ میں شورش پسندوں کا ہاتھ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ امن و اطمینان کی فضا پیدا نہ ہو اور ایسے حالات رہیں کہ حضرت علی ان پر ہاتھ نہ ڈال سکیں۔

حضرت علی نے یمن کا حاکم اپنے چچازاد بھائی عبید اللہ بن عباس کو مقرر کیا جب یہ یمن پہنچے تو حضرت عثمان کے مقرر کردہ گورنر یعلیٰ بن امیہ بیت المال کا سارا مال لے کر مکہ معظمہ روانہ ہو گئے۔

قیس بن سعد مصر کے گورنر مقرر کیے گئے، جب وہ مصر پہنچے تو ایک جماعت نے تو ان کا خیر مقدم کیا مگر دوسری جماعت نے کہا اگر حضرت علی، حضرت عثمان کے قاتلوں سے قصاص لیں گے تو ہم تمہارے ساتھ ہیں ورنہ تم سے بے تعلق ہو جائیں گے یہ خربتی میں پناہ گزیں ہو گئے۔ تیسرے گروہ نے کہا کہ اگر حضرت علی نے ہمارے آدمیوں سے قصاص لیا تو ہم الگ ہو جائیں گے۔

عثمان بن حُنیف، بصرہ کے والی مقرر کیے گئے۔ جب وہ بصرہ پہنچے تو سابق والی عبداللہ بن عامر بیت المال کا مال سمیٹ کر مکہ معظمہ چلے آئے۔

کوفہ کا گورنر عمارہ بن شہاب کو مقرر کیا۔ وہاں حضرت ابو موسیٰ اشعری حضرت عثمان کے زمانہ میں گورنر تھے۔ کوفہ والے ان کو پسند کرتے تھے۔ انھوں نے عمارہ کو واپس ہونے پر مجبور کر دیا۔ اور ابو موسیٰ اشعری نے ہی حضرت علی کی بیعت لے کر ان کو اپنی طرف سے مطمئن کر دیا۔

مکہ معظمہ کی حکومت پر حضرت علی نے خالد بن عاص کو مقرر کیا۔ لیکن مکہ والوں نے ان کے ہاتھ پر حضرت علی کی بیعت سے انکار کر دیا اور قاتلینِ عثمان سے قصاص کا مطالبہ کیا۔ ایک نوجوانِ مکی نے حضرت علی کے فرمان کو چاک کر زمزم کے کنوئیں میں ڈال دیا۔

حضرت معاویہ کا انکار

ملکِ شام کا معاملہ خاص طور پر اہم تھا۔ وہاں حضرت معاویہ بن ابی سفیان حضرت عمر کے

زمانہ سے والی چلے آرہے تھے۔ اہلِ شام ان پر جان چھڑکتے تھے۔ اور ان کے پاس زبردست بری و بحری فوجیں تھیں، جن سے وہ رومی شہنشاہیت سے ٹکر لیتے رہتے تھے۔ وہ خلیفۂ شہید حضرت عثمان کے چچازاد بھائی تھے اور ان کے ولی۔ اُن کا خیال تھا کہ حضرت علی نے حضرت عثمان کی مدد پوری طرح نہیں کی۔ اور اب بھی وہ قاتلینِ عثمان سے ربط و ضبط رکھ رہے ہیں اور ان کا قصاص نہیں لیتے۔

حضرت علی نے سہل بن حنیف کو ولایت کا فرمان دے کر ملکِ شام کی طرف روانہ کیا۔ مگر تبوک کے مقام پر جو شام کی سرحد ہے، حضرت معاویہ کے سپاہیوں نے ان کو روک دیا اور مدینہ واپس جانے پر مجبور کر دیا۔

کچھ عرصہ بعد، حضرت علی نے سبرہ جہنی کو ملکِ شام بھیج کر حضرت معاویہ سے بیعت اور اطاعت کا مطالبہ کیا۔ حضرت معاویہ نے بنی عبس کے ایک بہادر اور زبان آور شخص کو جواب میں ایک طومار (پروانہ) دے کر مدینہ منورہ بھیجا۔ اس نے اسے مجمعِ عام میں حضرت علی کے سامنے کھولا۔ اس میں صرف "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" لکھی ہوئی تھی۔ اور سرنامہ پر یہ عبارت لکھی تھی:

"معاویہ کی طرف سے علی کے نام"

باقی خط خالی تھا۔ گویا معاویہ کی طرف سے علی کو کورا جواب ہے۔ حضرت علی نے قاصد سے پوچھا، کیا معاملہ ہے؟

قاصد بڑا زبان زور شخص تھا۔ اُس نے کہا "حضرت میں ایسی قوم کی طرف سے آرہا ہوں جو قصاصِ عثمان کے سوا کسی بات پر راضی نہ ہوں گے۔ میں نے دمشق میں ساٹھ ہزار لوگوں کو خون آلود قمیصِ عثمان کے نیچے، جو جامع دمشق کے منبر پر رکھی ہوئی ہے، روتے دیکھا ہے"

حضرت علی نے یہ سُن کر کہا کہ میں خود عثمان کی طرح دشمنوں سے گھرا ہوا ہوں، ان کے قاتل تو ہاتھ سے نکل گئے۔ پھر اپنے ہاتھ اٹھا کر کہا:

"اے اللہ میں تیری بارگاہ میں خونِ عثمان سے برات ظاہر کرتا ہوں"
اس کے بعد یہ قاصد واپس جانے لگا تو حضرت علی کے آدمیوں نے اُسے قتل کرنا چاہا۔ مگر حضرت علی نے اُن کو روک دیا۔ اور یہ قاصد بمشکل جان بچاکر نکل گیا۔

اس واقعہ سے حضرت علی کو معلوم ہوگیا کہ حضرت معاویہ ان کی خلافت تسلیم نہ کریں گے۔ اور اُن سے ان کو ٹکر لینی ہی پڑے گی۔ پھر آپ نے شام پر حملہ آور ہونے کی تیاریاں شروع کر دیں [۱]

---

[۱] محاضرات الخضری ج ۲ ص ۸۱ والاخبار الطوال دینوری ص ۱۴۲

حضرتِ عائشہ کی مُداخلت

جنگِ جمل

حضرت علی ملکِ شام پر حملہ آور ہونے کی تیاریاں ہی کر رہے تھے کہ مکہ معظمہ سے ایک نئے ہنگامہ کی خبریں آئیں۔

حضرت اُمّ المومنین عائشہ رضؓ حج کے لیے مکہ معظمہ گئی ہوئی تھیں۔ ادائیگیِ حج کے بعد مدینہ منورہ واپس ہو رہی تھیں کہ راستہ میں ان کو معلوم ہوا کہ حضرت عثمان کو آفاقیوں نے شہید کر دیا ہے۔ حضرت علی نئے خلیفہ مقرر ہوئے ہیں، مگر وہ مُفسدوں کے نرغہ میں ہیں۔ شہر میں کسی کی جان اور آبرو محفوظ نہیں ہے۔ یہ سُن کر حضرت عائشہ مکہ معظمہ واپس آگئیں۔ اور شہادتِ عثمان پر رنج وغم کا اظہار کیا۔

جلد ہی حضرت زبیر اور حضرت طلحہ بھی مدینہ منورہ سے نکل کر مکہ معظمہ آگئے۔ انھوں نے تفصیلی حالات بیان کیے اور یہ بھی کہا کہ انھوں نے نئے خلیفہ سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ مفسدوں سے خلیفۂ شہید کا قصاص لیں۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ ابھی اس معاملہ میں جلدی نہ کی جائے۔ حالانکہ مفسدین کا زور اور بڑھتا جا رہا ہے۔ آپ ام المومنین ہیں، سب مسلمان آپ کا احترام کرتے ہیں۔ ایسی کوشش کیجیے کہ شر و فساد ختم ہو، مفسدین کا زور ٹوٹے اور ان سے خلیفۂ شہید کا قصاص لیا جائے۔

حضرت عائشہ نے اس قضیہ میں پڑنے سے انکار کیا تو انھوں نے کہا: اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ (الحجرات ۹)	اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو تم ان دونوں کے درمیان صلح کراؤ۔ اگر ان کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو تم بھی اس سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع کرے۔

یہ سن کر حضرت عائشہؓ اس جھگڑے کو طے کرانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ بصرہ سے وہاں کے عامل عبداللہ بن عامر اور یمن سے یعلی بن امیہ بھی آ گئے تھے۔ انھوں نے بھی ہر قسم کی مدد دینے کے لیے آمادگی ظاہر کی۔ ادھر مکہ معظمہ کے عامل عبداللہ بن حضرمی، جنھیں حضرت علی کا برخاستگی کا حکم مل چکا تھا، پہلے ہی ہر قسم کی اعانت کے لیے آمادہ تھے۔ مروان اور بنی امیہ کے دوسرے افراد بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اس طرح مکہ معظمہ میں اُن لوگوں کی بہت بڑی جماعت اکٹھا ہو گئی جو حضرت علی کے حامی نہ تھے اور حضرت عثمان کے قصاص کا مطالبہ کر رہے تھے۔

آخر مشورہ کے بعد طے ہوا کہ کسی طرح حضرت علی کو مفسدوں کے نرغہ سے نکال لیا جائے۔ پھر اُن کے معین و مددگار بن کر ان شر پسندوں سے حضرت عثمان کے خون کا انتقام لیا جائے۔ یہ بھی طے ہوا کہ یہ کام مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے مقدس مقامات کے علاوہ کہیں اور سے ہو۔ کیونکہ اندیشہ تھا کہ مفسد بن ان مقامات کے احترام کو نقصان پہنچائیں گے۔ آخر طے ہوا کہ بصرہ کو مرکز بنا کر یہ کام وہاں سے شروع کیا جائے۔ چنانچہ یہ قافلہ حضرت عائشہ و حضرت زبیر و حضرت طلحہ کی سرکردگی میں مکہ معظمہ سے نکلا۔

حضرت عائشہ بصرہ میں

جب یہ لوگ بصرہ کے قریب پہنچے اور عثمان بن حنیف کو (جو حضرت علی کی طرف سے

والیِ بصرہ تھے) ان کی آمد کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے دو شخصوں عمران بن حصین اور ابوالاسود دُؤلی کو تفتیشِ حال کے لیے بھیجا۔ یہ دونوں، حضرت زبیر، حضرت طلحہ اور حضرت عائشہ سے ملے اور اُن سے آنے کا مقصد پوچھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ مفسدین نے حرمِ رسول اللہ کی بے حرمتی کی ہے اور امام المسلمین کو ناحق شہید کر دیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اُن سے خلیفۂ مظلوم حضرت عثمان کا قصاص لیا جائے۔ ہم یہاں اسی لیے آئے ہیں کہ مسلمانوں کو اس کارِ خیر پر آمادہ کریں۔

ان لوگوں نے حضرت زبیر و طلحہ سے پوچھا کہ آپ تو حضرت علی کے ہاتھ پر بیعت کر چکے۔ اب ان کی اطاعت ہر حال میں آپ پر ضروری ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم سے بزورِ شمشیر بیعت لی گئی تھی۔

ان دونوں قاصدوں نے، عثمان بن حنیف کو، بصرہ آکر اُن کے جواب سے آگاہ کیا۔ عثمان نے مقابلہ کا فیصلہ کیا۔ مگر بصرہ میں لوگوں میں اختلافِ رائے ہو گیا۔ اس لیے حضرت علی کے حامیوں کو ساتھ لے کر وہ بصرہ سے باہر نکلے اور مربد کے بائیں طرف قیام کیا۔

حضرت زبیر و طلحہ کا لشکر مربد کے دائیں طرف ٹھہرا۔ بصرہ میں جو ان کے حامی تھے وہ بھی آکر ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔

کئی روز تک دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل صف آرا رہے۔ دونوں میں کچھ چھیڑ چھاڑ بھی ہوئی، مگر حضرت عائشہ کی مداخلت سے جنگ رُک گئی۔ آخر طے ہوا کہ کسی معتبر شخص کو مدینہ منورہ بھیج کر معلوم کیا جائے کہ حضرت زبیر و حضرت طلحہ نے حضرت علی کی بیعت رضامندی سے کی ہے یا جبراً۔ اگر معلوم ہو جائے کہ جبراً بیعت لی گئی ہے تو عثمان بن حنیف کی جماعت بھی ان کے ساتھ شریک ہو جائے ورنہ عثمان بن حنیف کے حریف ان کے ساتھ ہو جائیں۔ آخر قاضیِ بصرہ کعب بن مسور مدینہ منورہ بھیجے گئے۔ انھوں نے مسجدِ نبوی میں اعلان کیا کہ وہ حضرت زبیر و طلحہ کی بیعت کی تحقیق کے لیے بصرہ سے آئے ہیں۔ اکثر لوگ

خاموش رہے۔ مگر حضرت اُسامہ بن زید نے جواب دیا کہ اُن صاحبان سے جبراً بیعت لی گئی ہے۔ اس پر کچھ لوگوں نے ہنگامہ کر دیا۔ حضرت علی نے عثمان بن حنیف کو لکھا کہ اگر ان دونوں پر جبر بھی کیا گیا ہے، تو یہ جبر اتفاق قائم کرنے کے لیے کیا گیا ہے، نہ کہ افتراق و اختلاف کے لیے۔ تم ان لوگوں کا مقابلہ کرو۔

اس کے بعد، حضرت زبیر و طلحہ نے عثمان سے مطالبہ کیا کہ وہ حسبِ فیصلہ ان کی حمایت کریں۔ مگر انھوں نے انکار کیا اور مقابلہ کے لیے نکلے مگر گرفتار ہوئے اور حضرت عائشہ کی سفارش سے چھوڑ دیے گئے اور وہاں سے نکل کر مدینہ منورہ حضرت علی کے پاس چلے گئے۔

اب بصرہ پر مخالفینِ علی کا قبضہ ہو گیا۔ جو لوگ قاتلینِ عثمان کے گروہ کے وہاں موجود تھے قتل کر دیے گئے۔ اُن میں حکیم بن جبلہ بھی تھا جو ابنِ سبا کا خاص آدمی تھا۔

حضرت علی بصرہ کو

حضرت علی کو، حضرت زبیر و طلحہ و حضرت عائشہ کے بصرہ کے قریب پہنچنے کا حال معلوم ہوا، تو انھوں نے بھی بصرہ ہی جانے کا فیصلہ کیا۔ اہلِ مدینہ میں سے بعض اکابر انصار و مہاجرین نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں آپس میں تلوار چلے۔ چنانچہ حضرت سعد بن وقاص، حضرت عبداللہ بن عمر، محمد بن مسلمہ نے حضرت علی کو سمجھایا کہ وہ مدینہ منورہ کو نہ چھوڑیں اور ایسا اقدام نہ کریں جس سے مسلمانوں کا شیرازہ بکھرے۔ مگر حضرت علی نے فرمایا کہ وہ جنگ کے لیے نہیں جا رہے، ان کو امید ہے کہ وہ گفتگو کر کے مخالفین کو اپنا ہم خیال بنا لیں گے۔ اگر مصالحت کی کوشش کامیاب نہ ہو سکی تب بھی عراق میں ان کے حامی زیادہ ہیں اور بصرہ اور کوفہ کے خزانے بھی بھرپور ہیں، ان سے وہ فائدہ حاصل کر سکیں گے۔

جب حضرت علی اپنے لشکر کے ساتھ بصرہ کے قریب پہنچے تو ان کو معلوم ہوا کہ حضرت زبیر و طلحہ بصرہ پر قابض ہو چکے ہیں۔

حضرت علی نے بصرہ کے قریب مقامِ ذی قار میں قیام کیا اور حضرت حسن کو

کوفہ روانہ کیا تاکہ وہاں سے امداد حاصل کریں۔

وہاں حضرت ابو موسیٰ اشعری جو کوفہ کے عامل بھی تھے، کوفہ کی جامع مسجد میں تقریر کر رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس فتنہ سے ڈرایا تھا وہ سر پر ہے۔ آپ کا حکم ہے کہ فتنہ کے وقت سونے والا بیٹھنے والے سے اور بیٹھنے والا چلنے والے سے بہتر ہے۔ اس لیے اپنے اپنے گھروں میں خانہ نشین ہو جاؤ۔

اسی دوران حضرت حسن مسجد میں پہنچ گئے۔ انھوں نے اہلِ کوفہ کو حضرت علی کی حمایت اور اعانت کی دعوت دی۔ کوفہ کے ایک با اثر شخص حجر بن عدی نے بھی ان کی تائید کی اور کہا: لوگو! امیر المومنین نے اپنے فرزند کو تمہارے پاس بھیجا ہے۔ تم اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جاؤ۔ اور فتنہ و فساد کی آگ کو سرد کرو۔

ان تقریروں سے متاثر ہو کر ساڑھے نو ہزار آدمی کوفہ سے نکل کھڑے ہوئے اور مقامِ ذی قار میں پہنچ کر حضرت علی کی فوج سے جا ملے۔ اب اپنے لشکر کو لے کر حضرت علی ذی قار سے آگے بڑھے اور بصرہ کا رُخ کیا۔

مُصالحت کی کوشش

مگر حضرت علی کی بھی دلی تمنا تھی کہ مسلمانوں کی تلواریں آپس میں نہ ٹکرائیں۔ اس لیے انھوں نے حضرت قعقاع کو اپنا سفیر بنا کر اپنے مخالفین کے پاس بھیجا۔

حضرت قعقاع پہلے ام المومنین حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے پوچھا: اماں جان آپ کا یہاں آنا کس مقصد سے ہے؟ حضرت عائشہ نے فرمایا، میرا مقصد صرف آپس میں مصالحت کرانا ہے تاکہ امن و امان کی فضا پیدا ہو۔ حضرت عائشہ نے قعقاع سے کہا کہ بہتر ہو کہ طلحہ و زبیر کو بھی بُلا لیا جائے۔ یہ دونوں بھی آ گئے تو قعقاع نے کہا: میں نے ام المومنین سے تشریف لانے کا مقصد معلوم کیا تھا تو انھوں نے تو باہم مصالحت اور اتحاد و اتفاق

بتایا۔ اب آپ بھی اپنا خیال ظاہر کیجیے۔ ان دونوں صاحبان نے کہا ہم ام المومنین کی رائے سے پورا اتفاق کرتے ہیں۔ ہم بھی چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کی جماعتوں میں اتحاد و اتفاق ہو اور ایک دوسرے سے نہ ٹکرائیں۔

حضرت قعقاع نے کہا، آپ کے نزدیک اتحاد و اتفاق کس طرح ہو سکتا ہے؟ حضرت طلحہ و زبیر نے کہا، حضرت عثمان کے قاتلوں سے قصاص لیا جائے۔ یہی سببِ اختلاف ہے۔ حضرت قعقاع نے کہا، قاتلینِ عثمان سے قصاص لینے کے لیے ضروری ہے کہ امیر المومنین کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں۔ سب لوگ مل کر اُن کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوں اور اُن کے مُعاون و مددگار ہوں۔

قعقاع کی اس رائے کو سب نے پسند کیا۔ اور طے پایا کہ دونوں گروہوں کے اکابر ایک جگہ جمع ہوں اور باہم گفت و شنید کر کے اپنی غلط فہمیوں کو دور کریں اور ایسے حالات پیدا کریں کہ حضرت علی مفسدین سے چھٹکارا پائیں اور حضرت عثمان کے مظلومانہ قتل کا قاتلوں سے قصاص لے سکیں۔

اس فیصلہ کے بعد حضرت قعقاع خوش خوش حضرت علی کے کیمپ میں پہنچے اور ان کو اس گفتگو کی اطلاع دی۔ حضرت علی بھی خوش ہوئے کہ اللہ نے اس مشکل کو آسان کر دیا اور اختلاف کی گھنگھور گھٹائیں چھٹنے کا وقت آ گیا۔

تین دن تک نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر طے ہوا کہ اگلے روز حضرت علی اور حضرت طلحہ و زبیر ذاتی طور پر بات چیت کر کے صلحنامہ پر دستخط کر دیں اور ایک دوسرے سے گلے مل لیں۔ یہ بھی طے ہوا کہ یہ ملاقات ان بزرگوں کی تنہا ہو۔

مُفسدین کی سازش

مفسدین کی بہت بڑی تعداد حضرت علی کے لشکر میں موجود تھی، ان کے جاسوس بھی لگے ہوئے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ اگر یہ مصالحت ہو گئی تو پھر ہماری خیر نہیں۔ دونوں گروہوں کا پہلا نشانہ ہماری گردنیں ہوں گی۔ آخر اُن لوگوں کا ایک خفیہ جلسہ ہوا۔ اور مفسدین کے سرگروہ عبداللہ بن سبا کی رائے سے طے ہوا کہ صبح کی روشنی

نمودار ہونے سے پہلے ہی حضرت عائشہ کی فوج پر حملہ کر دیا جائے۔ جب جنگ شروع ہو جائے گی تو مصالحت کا سلسلہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ دونوں طرف کے بزرگ مطمئن تھے اور دونوں طرف کے لشکری میٹھی نیند سو رہے تھے کہ مفسدین کے دو ہزار سپاہی اپنے حریفوں پر حملہ آور ہوئے۔ دوسری طرف سے بھی جوابی حملہ کیا گیا۔

حضرت طلحہ و زبیر شور و غل سُنکر اپنے خیموں سے نکل کر باہر آئے۔ اور معلوم کیا کہ کیسا شور ہے؟ ان کے آدمیوں نے بتایا کہ حضرت علی کے سپاہیوں نے ان پر حملہ کر دیا ہے۔ انھوں نے کہا: افسوس علی خوں ریزی سے باز نہ آئے۔ اِدھر حضرت علی نے اپنے آدمیوں سے ہنگامہ کی وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا کہ حضرت عائشہ کی فوج نے حملہ کر دیا ہے۔ حضرت علی نے بھی کہا، افسوس طلحہ و زبیر نے عہد شکنی کی۔

اب دونوں طرف سے سخت جنگ کا آغاز ہو گیا۔ مسلمانوں کی تلواریں مسلمانوں ہی کی گردنوں میں پیوست ہونے لگیں۔ حضرت علی نے اپنے حامیوں کو اور حضرت عائشہ نے اپنے فدائیوں کو روکنا چاہا۔ مگر لڑائی کی بھڑکتی آگ سرد نہ ہو سکی۔

حضرت عائشہ میدان میں

قاضیِ بصرہ حضرت کعب بن مسور نے حضرت عائشہ سے کہا: آپ خود میدانِ جنگ میں تشریف لے جائیے اور فریقین کو جنگ بند کرنے کی تلقین کیجیے۔ شاید رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے آپ کے تعلق کو پیشِ نظر رکھ کر لوگ آپ کی بات سُنیں۔ حضرت عائشہ ایک اونٹ پر سوار ہو کر خود میدانِ جنگ میں تشریف لے گئیں۔ آپ کے ہودج کو زرہوں سے ڈھک دیا گیا تھا۔

اہلِ بصرہ حضرت عائشہ کے اونٹ کے اردگرد اس کی حفاظت کے لیے جمع تھے۔ خصوصاً بنی ضبّہ رجز پڑھ پڑھ کر ام المومنین پر اپنی جانیں قربان کر رہے تھے۔ حضرت عائشہ تو محفوظ رہیں مگر سبائیوں نے ان کے ہودج کو اپنے

تیروں سے چھید ڈالا۔

لڑائی زور شور سے جاری تھی کہ حضرت علی اور حضرت زبیر کا آمنا سامنا ہوگیا۔ حضرت علی نے حضرت زبیر سے کہا، ابو عبداللہ تمہیں وہ واقعہ یاد ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا تم علی کو دوست رکھتے ہو؟ تو تم نے جواب دیا تھا کہ بے شک یارسول اللہ! تب حضور نے تم سے کہا تھا کہ ایک روز تم علی سے ناحق لڑو گے۔ حضرت زبیر نے کہا ہاں مجھے یاد آگیا۔

اس گفتگو کے بعد حضرت زبیر لڑائی سے کنارہ کش ہو کر بصرہ کی طرف چل دیے۔ راستہ میں حضرت علی کے حامیوں میں سے ایک شخص ابن جرموز نے آپ کو شہید کر دیا۔ پھر ابن جرموز اپنے اس کارنامہ کی خوشخبری سنانے حضرت علی کے پاس پہنچا، تو حضرت علی نے فرمایا: میں تجھے جہنم کی بشارت دیتا ہوں۔

حضرت طلحہ نے جو حضرت زبیر کو لڑائی سے کنارہ کش ہوتے دیکھا تو انھوں نے بھی میدانِ جنگ سے الگ ہو جانے کا ارادہ کرلیا۔ مگر مروان بن حکم نے ایک زہر آلود تیر مار کر ان کو شہید کر دیا۔

ان دونوں بزرگوں کے لڑائی سے علیحدہ ہو جانے سے، اُن کے طرفداروں کا جوش سرد پڑ گیا، اور اِدھر شکست کے آثار نظر آنے لگے۔ مگر حضرت عائشہ کے محافظ بڑی جاں نثاری کا مظاہرہ کرتے رہے۔ سبائی اُن کو زندہ گرفتار کرکے ان کی بے حرمتی کرنا چاہتے تھے، مگر بنی ضبہ ان پر جانیں قربان کر رہے تھے اور کسی طرح دشمنوں کو ان کے قریب نہ پھٹکنے دیتے تھے۔

خاتمۂ جنگ حضرت علی نے محسوس کیا کہ جب تک ام المومنین کا اونٹ میدان میں موجود ہے، جنگ ختم نہ ہوگی۔ آپ نے ایک

شخص کو حکم دیا کہ اونٹ کی کونچیں کاٹ دی جائیں۔ اس حکم کی تعمیل کی گئی اور اونٹ بلبلا کر زمین پر گر پڑا۔ اس کے بعد لڑائی ختم ہو گئی۔

حضرت علی نے اعلان کرا دیا کہ اب بھاگنے والوں کا تعاقب نہ کیا جائے، جو ہتھیار ڈال دے اس سے تعرض نہ کیا جائے، مالِ غنیمت نہ لوٹا جائے۔

پھر حضرت عائشہ کے بھائی محمد بن ابو بکر سے فرمایا کہ اپنی بہن کو عزت و احترام کے ساتھ اُتارو۔ انھوں نے تعمیلِ حکم کی۔ خدا کے فضل سے حضرت عائشہ محفوظ رہیں، صرف ایک تیر کا ٹکڑا ان کی کلائی میں پھنسا ہوا تھا جسے الگ کر دیا گیا۔ حضرت علی خود حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے خیریت پوچھی۔ انھوں نے کہا، خیریت سے ہوں خدا تمہاری غلطی معاف کرے۔ حضرت علی نے کہا، خدا آپ کی غلطی بھی معاف کرے۔ لڑائی کے خاتمہ کے بعد حضرت علی نے میدانِ جنگ کا چکر لگایا۔ اس لڑائی میں دونوں طرف کے تقریباً دس ہزار آدمی کام آئے۔ حضرت علی نے ان کی نمازِ جنازہ ادا کی اور ان کو دفن کرنے کا حکم دیا۔

حضرت علی گشت کر رہے تھے کہ ایک جگہ حضرت طلحہ کی لاش پر نظر پڑی آپ نے رقت کے لہجہ میں فرمایا، ابو محمد تم اس حال میں پڑے ہو، کاش میں آج سے بیس برس پہلے مر گیا ہوتا۔ پھر ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر بار بار چومااور فرمایا: یہ ہاتھ وہ ہے جس نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مصیبتوں کو دفع کیا ہے۔

بصرہ میں حضرت عائشہ کو صفیہ بنت الحارث کے شاندار مکان میں اُتارا گیا۔ کچھ دن آرام کرنے کے بعد ان کو ان کے بھائی محمد بن ابو بکر کے ساتھ مدینہ منورہ بھیج دیا گیا۔ ان کی دلداری کے لیے بصرہ کی چالیس شریف عورتوں کو ان کے ساتھ کیا گیا۔ حضرت علی چند میل ان کے ساتھ مشایعت کے لیے گئے۔ رخصت کے وقت حضرت علی حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت عائشہ

نے ان لوگوں کو جو اس وقت بڑی تعداد میں جمع ہو گئے تھے مخاطب کر کے فرمایا:

"میرے بچو! میری اور علی کی کش مکش محض غلط فہمی کی بنیاد پر تھی۔ میرا اُن سے کوئی نزاع نہ تھا"

حضرت علی نے فرمایا:

"بے شک یہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ اور ہم سب کی ماں ہیں۔ ان کی تعظیم و احترام ہم سب پر لازم ہے۔"

بصرہ میں حضرت علی نے اہلِ بصرہ کی بیعت لی اور بصرہ کا والی حضرت عبداللہ بن عباس کو مقرر کیا۔

بصرہ میں چند روز ٹھہر کر حضرت علی کوفہ پہنچے۔ جمعہ کے روز جامع مسجد میں نماز ادا کی اور بعد نماز ایک خطبہ دیا جس میں لوگوں کو تقویٰ اور پرہیزگاری کی تعلیم دی۔ پھر کوفہ ہی کو مرکزِ خلافت بنا کر وہیں مستقل قیام اختیار کر لیا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ کوفہ میں حضرت علی کے حامی زیادہ تھے اور یہ بھی کہ وہ باہمی جھگڑوں کی وجہ سے مدینہ منورہ کی بے احترامی پسند نہ کرتے تھے۔

جنگِ صفّین

کوفہ میں کچھ مدت قیام کے بعد حضرت علی نے اپنے اصل حریف حضرت معاویہ کے مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دیں جنھوں نے ان کی خلافت تسلیم نہیں کی تھی۔

حضرت معاویہ تقریباً بیس سال سے شام کے والی تھے۔ شام کی حدد رومی علاقہ سے ملتی تھیں۔ انھوں نے شہنشاہِ روم سے بارہا کامیاب ٹکر لی تھی، اور رومی شہنشاہیت کے مشرقی بازو کو اس سے جُدا کر دیا تھا۔ اس مقصد کے لیے جو عظیم الشان فوج ان کے جھنڈے تلے جمع تھی وہ ان کی مطیع و فرماں بردار اور فدا کار و جاں نثار تھی۔ حضرت علی نے جن اُموی عاملوں کو برطرف کر دیا تھا وہ بھی ان کے یار و مددگار بن گئے تھے۔ اور بنی امیہ کے اکثر سردار حضرت عثمان کی شہادت کے بعد ان کے اردگرد جمع ہو گئے تھے۔ حضرت نائلہ (زوجۂ حضرت عثمان) کی کٹی ہوئی انگلیاں اور حضرت عثمان کا خون آلود پیرہن، جسے یہ لوگ اپنے ساتھ لائے تھے، ہر نماز کے بعد جامع دمشق میں ان کی نمائش کی جاتی تھی۔ اس سے ان لوگوں میں اور جوش و خروش پیدا ہوتا تھا۔ اور انتقام انتقام کی صداؤں سے مسجد گونج جاتی تھی۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ اور زیاد بن ابی سفیان جیسے مُدبّر سیاسی لوگ بھی حضرت علی سے برگشتہ ہو کر حضرت معاویہ سے آملے تھے، اور ممتاز فاتح حضرت عمرو بن عاص کو بھی مصر کی گورنری دینے کا وعدہ کر کے انھوں نے اپنا حامی بنا لیا تھا۔

ان وجوہات سے حضرت معاویہ کا مقابلہ آسان کام نہ تھا۔ جنگ جمل میں دس ہزار مسلمانوں کی جانیں ضائع ہونے سے حضرت علی کو دلی کرب تھا۔ دل سے چاہتے تھے کہ فرزندانِ اسلام کی تلواریں ایک دوسرے کی گردن پر

نہ چلیں۔ اس لیے آپ نے جریر بن عبداللہ بجلی کو قاصد بنا کر حضرت معاویہ کے پاس ملکِ شام بھیجا اور انھیں مصالحت اور بیعت کی دعوت دی۔ حضرت معاویہ نے ان کو چند روز ٹھہرایا۔ انھوں نے دیکھا کہ اہلِ شام حضرت عثمان کے انتقام پر تُلے ہوئے ہیں اور قسمیں کھا رکھی ہیں کہ وہ فرش پر نہ سوئیں گے جب تک قاتلینِ عثمان سے قصاص نہ لے لیں گے۔ چند روز قیام کر کے جریر ناکام واپس ہوئے۔ چلتے وقت حضرت معاویہ نے بھی اپنا ایک قاصد جواب دے کر ان کے ساتھ کر دیا۔ جواب یہ تھا کہ "عثمان کے قاتلوں کو ہمارے حوالہ کر دو تو ہم بیعت کے لیے تیار ہیں ورنہ نہیں"

حضرت معاویہ کے قاصد ابو مسلم نے کوفہ پہنچ کر حضرت معاویہ کا جواب حضرت علی کے سامنے پیش کیا تو دس ہزار مسلح سپاہی کھڑے ہو گئے اور چیخ کر کہا:

"ہم سب عثمان کے قاتل ہیں ہمیں لے چلو"

پھر حضرت علی نے ابو مسلم سے کہا تم دیکھ لو، قاتلینِ عثمان پر میرا کتنا اختیار ہے۔

اس نامہ و پیغام سے یہ بات صاف ہو گئی کہ ابھی مسلمانوں کی تلواریں آپس میں ٹکرانی ہیں۔ اور ابھی زمین ان کے خون کی پیاسی ہے۔

حضرت علی کوفہ سے نکلے اور مقامِ نخیلہ میں قیام کیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس بھی بصرہ سے اپنا لشکر لے کر اُن سے آملے۔ دوسرے والی اور سردار بھی اپنے آدمیوں کو لے کر یہاں پہنچ گئے۔ حضرت علی نے اپنے نوّے ہزار حامیوں کا لشکر یہاں مُرتّب کیا۔ پھر جزیرہ کے راستہ پر آگے بڑھے اور رقہ سے دریائے فرات کو عبور کر کے سرحدِ شام میں داخل ہو گئے اور صفین کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ حضرت معاویہ کو خبر ملی تو وہ بھی اپنے پچاسی ہزار کے لشکر کو لے کر مقابلہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ اور صفین پہنچ کر پہلے ہی نہرِ فرات پر قبضہ کر لیا۔

حضرت علی کی فوج کو حریف کے دریا پر قابض ہونے کی وجہ سے سخت مشکل پیش

آئی۔ حضرت معاویہ کے افسر اُن کو پانی لینے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ آخر حضرت علی نے اپنی فوج کو بزور پانی پر قبضہ کرنے کا حکم دیا۔ پیاسے آگے بڑھے اور گھاٹ پر قبضہ کر لیا۔ مگر انھوں نے حضرت معاویہ کے لشکریوں کو بھی پانی لینے سے نہ روکا۔

کئی مہینے تک دونوں لشکر آمنے سامنے پڑے رہے۔ مصالحت کی کوششیں ہوتی رہیں اور قاصد آتے جاتے رہے۔ اس دوران میں معمولی جھڑپیں بھی ہوتی رہیں۔

دونوں طرف کے عُلماء اور صُلحاء چاہتے تھے کہ یہ خانہ جنگی ختم ہو۔ مگر افسوس ایک طرف سردارانِ بنی امیہ کی ضد اور دوسری طرف قاتلینِ عثمان کی شرارت کی وجہ سے یہ کوششیں ناکام ہوئیں۔

آخر محرم ۳۷ھ کے ختم ہونے کے بعد، معرکہ کارزار گرم ہو گیا۔ عراقیوں اور شامیوں کی تلواریں، جن میں سے ایک نے کسریٰ کے تخت کو اُلٹا تھا اور دوسرے نے قیصر کے جھنڈے کو سرنگوں کیا تھا، آپس میں ٹکرانے لگیں۔ دونوں طرف کے بہادر بڑھ بڑھ کر دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ کبھی ایک فریق غالب آتا، کبھی دوسرا۔ یہ صورتِ حالات کئی روز چلتی رہی۔ آخر حضرت علی نے ایک روز اپنے لشکر میں پُرجوش تقریر کی اور اپنے لشکر کو حضرت معاویہ پر فیصلہ کُن حملہ کا حکم دیا۔ اگرچہ اب تک شامیوں نے بڑی جاں بازی سے مقابلہ کیا تھا مگر اس سخت حملہ سے ان کے پاؤں اُکھڑ گئے۔

اب حضرت معاویہ نے حضرت علی کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر ہم دونوں کو معلوم ہوتا کہ یہ لڑائی اتنا طول کھینچے گی تو غالباً اسے ہم نہ چھیڑتے۔ ہم دونوں عبدِ مناف کی اولاد ہیں۔ بہتر ہو کہ آپس میں باعزت مصالحت ہو جائے۔ مگر حضرت علی نے مصالحت سے انکار کر دیا۔ کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ ان کی فتح میں اب دیر نہیں۔

قرآن نیزوں پر

اس وقت عمرو بن عاص کے اشارہ پر اہلِ شام نے اپنے نیزوں پر قرآنِ کریم باندھ کر چیخنا شروع کر دیا:

"یہ خدائے عزوجل کی کتاب ہے جسے ہم اپنے اور اپنے مخالفین کے درمیان حَکَم تجویز کرتے ہیں۔ اگر اہلِ عراق ختم ہو گئے تو مشرقی سرحدوں کی حفاظت کون کرے گا۔ اور اگر اہلِ شام نہ رہے تو مغربی سرحدوں کی حفاظت کون کرے گا"

حضرت علی اور ان کے ایک فدا کار اشتر نخعی نے اپنے آدمیوں کو سمجھایا کہ یہ دشمن کی چال ہے۔ ہماری فتح میں اب زیادہ دیر نہیں۔ مگر حضرت علی کے اکثر لشکریوں نے، جو لڑائی سے تنگ آ گئے تھے، کہا "ہم کو یہ تجویز منظور ہے، قرآن کے فیصلہ کو ہمیں رد نہ کرنا چاہیے"

ان کے ایک سردار اشعث بن قیس کندی نے کہا:

"اگر مسلمان اسی طرح ایک دوسرے کی گردنیں کاٹتے رہے تو تمام عرب ویران ہو جائے گا۔ رومی شام میں اور ایرانی عراق میں ہمارے اہل و عیال کو غلام بنا لیں گے"

حضرت علی کے بعض لشکریوں نے ان کو دھمکی بھی دی کہ اگر آپ قرآن کے فیصلہ کو نہ مانیں گے تو ہم آپ کو بھی ٹھکانے لگا دیں گے۔ آخر انھیں بادلِ ناخواستہ خاموش ہونا پڑا اور جنگ ملتوی ہو گئی۔

عہد نامۂ تحکیم

اس افسوسناک معرکہ آرائی کے نتائج بد کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ میدانِ صفین میں دونوں طرف کے مقتولین کا اندازہ ستر ہزار سے نوّے ہزار تک ہے۔ یہ وہ تعداد ہے کہ جو تاریخ اسلام کے اب تک کے تمام معرکوں کے شہداء کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ ہے۔ یہ لڑائی تقریباً ۹ مہینے چلتی رہی اور اس مدت میں نوّے مرتبہ آپس میں ٹکریں ہوئیں۔ لڑائی کے خاتمہ کے بعد دونوں طرف کے ذمہ دار لوگ جمع ہوئے اور بحث و گفتگو کے بعد طے پایا کہ "فریقین ایک ایک شخص کو پنچ نامزد کردیں اور ان سے عہد لیں کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے مطابق فیصلہ کریں گے۔ پھر یہ دونوں جس طرح اس نزاع کا فیصلہ کریں گے اُسے دونوں فریق بلاپس و پیش تسلیم کریں گے"۔

پنچوں کی نامزدگی کا وقت آیا تو اہلِ شام کی طرف سے بالاتفاق حضرت عمرو بن عاص کا نام تجویز کیا گیا۔ مگر حضرت علی کی جماعت میں اختلاف رائے ہوا۔ حضرت علیؓ عبداللہ بن عباس یا اشتر نخعی کو پنچ بنانا چاہتے تھے مگر ان کے اکثر حامی حضرت ابو موسیٰ اشعری کا نام تجویز کر رہے تھے۔ آخر یہاں بھی حضرت علی کو ان کی بات ماننی پڑی اور ان کی طرف سے حضرت ابو موسیٰ اشعری پنچ تجویز ہوئے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری حضرت علی کے کٹر حامی نہ تھے۔ انھوں نے جنگ جمل کے موقعہ پر اہل کوفہ کو اس فتنہ سے الگ تھلگ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ دوسری طرف حضرت عمرو بن عاص حضرت معاویہ کے پُرجوش حامی تھے۔ آخر رمضان ۳۷ھ میں حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت عمرو بن عاص دومۃ الجندل کے مقام پر جمع

ہوئے۔ ہر ایک کے ساتھ چار چار سو آدمیوں کی جمعیّت تھی۔ ان میں حضرت عبداللہ بن عمر، سعد بن ابی وقاص اور عبداللہ بن زبیر جیسے بزرگ بھی شامل تھے۔

حکمین کا فیصلہ

دونوں حکموں کی گفتگو شروع ہوئی۔ عمرو بن عاص، حضرت ابو موسیٰ اشعری سے بہت ادب و احترام سے گفتگو کرتے تھے اور اُن کو اپنا ہم خیال بنانے کی پوری کوشش کرتے تھے۔

انھوں نے گفتگو شروع کرتے ہوئے حضرت ابو موسیٰ سے پوچھا: کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ حضرت عثمان خلیفۂ برحق تھے اور ان کو ظلم کے ساتھ شہید کیا گیا؟

ابو موسیٰ نے کہا بے شک، مجھے یہ بات تسلیم ہے۔

پھر عمرو بن عاص نے کہا: کیا قرآن شریف کا یہ حکم نہیں ہے کہ جسے ظلماً قتل کیا جائے اس کے ولی کو اس کے قصاص کے مطالبہ کا حق ہے (مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطَانًا) ابو موسیٰ نے کہا: مجھے اس سے بھی اتفاق ہے۔

پھر عمرو بن عاص نے کہا، اے ابو موسیٰ! معاویہ حضرت عثمان کے ولی ہیں۔ وہ ان کے قصاص کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ وہ حضرت ام حبیبہ ام المومنین کے بھائی ہیں اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ممتاز صحابی، صاحبِ تدبّر و سیاست آدمی ہیں۔ کیوں نہ ہم ان کے حامی بن کر ان کے مددگار ہوں۔ ابو موسیٰ نے کہا: رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے تقرّب کے لحاظ سے حضرت علی ان پر فائق ہیں۔ وہ قریش میں سب سے افضل ہیں۔ لیکن اگر تم ان کو پسند نہیں کرتے تو ہم میں عبداللہ بن عمر موجود ہیں۔ اگر ہم ان کو خلیفہ بنا دیں تو حضرت فاروقِ اعظم کا زرّیں عہد لوٹ آئے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی بھی حاصل ہو۔ یوں بھی وہ ان جھگڑوں سے الگ تھلگ رہے ہیں۔

عمرو بن عاص بولے، تو پھر میرے فرزند عبداللہ بن عمرو میں کیا بُرائی ہے وہ بھی نیک اور صالح ہے۔ ابو موسیٰ نے جواب دیا: تمہارا فرزند بھی بے شک پارسا آدمی ہے مگر اس کو تم نے جھگڑوں میں ملوّث کر دیا ہے۔

پھر ابو موسیٰ نے کہا اے عمرو، مسلمانوں میں بہت کشت و خون ہو چکا ہے، اب انھوں نے معاملہ ہم دونوں کے سپرد کر دیا ہے، کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ یہ جھگڑا ختم ہو۔ اب میری رائے یہ ہے کہ ہم دونوں دعویدارانِ خلافت کو معزول کر دیں اور امتِ اسلامیہ کو اختیار دیں کہ وہ باہم مشورہ سے جسے مناسب سمجھیں خلیفہ انتخاب کر لیں۔

عمرو بن عاص نے کہا: مجھے اس رائے سے پورا اتفاق ہے۔

یہ گفتگو قلم بند کر لی گئی۔ اس کا خلاصہ یہی تھا کہ حضرت معاویہ اور حضرت علیؓ دونوں کو الگ کر دیا جائے، اور مسلمانوں کی مجلسِ شوریٰ کو انتخابِ خلیفہ کا حق دے دیا جائے۔ چنانچہ اس فیصلہ کا مجمع عام میں دونوں حکموں نے اعلان کر دیا۔

حضرت معاویہ کی جیت

یہ فیصلہ دراصل حضرت معاویہ کے حق میں مفید تھا۔ ان کو مسلمانوں کی کسی نمائندہ جماعت نے خلیفہ منتخب نہیں کیا تھا، صرف اہلِ شام نے ان کو خلیفہ بنا لیا تھا۔ برخلاف حضرت علی کے جن کو مدینہ منورہ میں مہاجرین و انصار اور بیرونی لوگوں نے مِل جُل کر خلیفہ منتخب کیا تھا۔ یہ انتخاب ان کی سب سے بڑی حُجّت تھی جو ختم کر دی گئی۔ اور وہ اور حضرت معاویہ دونوں ایک سطح پر آ گئے۔ چونکہ حضرت معاویہ کی جماعت میں اتحاد و اتفاق تھا اور ان کے سب حامی یک دل و یک زبان تھے، اس لیے ان کو منصبِ خلافت کی آرزو پورا کرنے کا بہترین موقعہ ہاتھ آ گیا۔

عمرو بن عاص اور ان کے ساتھی ملکِ شام پہنچے تو انھوں نے حضرت معاویہ کو خلافت کی مبارک باد دی۔ اہلِ شام نے اُن کی متفقہ طور پر بیعت کر لی اور ان کو خلیفۃ المسلمین کے لقب سے پکارنا شروع کر دیا۔ حضرت علی کو اس فیصلہ کی خبر ہوئی تو انھوں نے اسے قبول کرنے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ وہ کتاب و سُنّت کے مطابق نہیں ہے۔ حالانکہ دونوں حَکم قرآن کریم اور سنتِ رسول اللہ کی روشنی میں فیصلہ کرنے کے پابند تھے۔

آپ نے (حضرت علیؓ نے) جامع کوفہ میں شام پر حملہ کرنے کا بھی اعلان کر دیا۔

عمرو بن عاص کی سیاست

مذکورہ بالا تفصیل سے حضرت ابو موسیٰ اشعری کے مقابلہ میں عمرو بن عاص کی ہوشیاری اور سیاست میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے اندازِ گفتگو ہی ایسا اختیار کیا کہ جو وہ چاہتے تھے اُسے اپنے ساتھی سے منوالیا۔ حضرت ابو موسیٰ اوّل تو سیدھے سچے اور صلح پسند بزرگ تھے۔ پھر چونکہ حضرت علی ان کے خلاف پہلے ہی اپنی رائے ظاہر کر چکے تھے، اس لیے انھیں بھی ان کی حمایت میں ایسی سرگرمی نہ رہی تھی۔

تحکیم کے سلسلہ میں مذکورہ روایت مشہور مورّخ مسعودی کی ہے[1]۔ اس کے علاوہ ایک دوسری روایت مورخ طبری کی بھی ہے، مگر وہ اصولِ درایت کی بنیاد پر قابلِ قبول نہیں۔

---

[1] مروج الذہب ج ۲ ص ۲۲ / ۲۷

ظہورِ خوارج

ایک نیا فتنہ

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ جب میدانِ صفین میں نیزوں پر قرآن اٹھا کر تحکیم کی تجویز پیش کی گئی تو حضرت علی اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ مگر اپنے حامیوں کی اکثریت کے اصرار پر آپ نے اسے منظور کر لیا۔ پھر جب آپ کوفہ واپس ہوئے تو انھیں میں سے ایک گروہ نے، جس کا سردار شبیث بن ربعی تھا، آپ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس گروہ نے اپنے نظریہ کی تشریح اس طرح کی:

6:57 اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ "حکم صرف اللہ تعالیٰ ہی کا قابلِ قبول ہے"،

حضرت علی اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ "مسلمانوں کے اہم معاملات باہمی مشورہ سے (خدا کے حکم کے مطابق) طے ہوتے ہیں"، کی روشنی میں مہاجرین و انصار کے اتفاقِ رائے سے خلیفہ منتخب ہوئے تھے۔ وہ خلیفہ برحق تھے۔ حضرت معاویہ نے ان کو خلیفہ ماننے سے انکار کیا، لہٰذا وہ کافر ہوئے۔ حضرت علی کو چاہیے تھا کہ قرآن کے حکم کے مطابق ان کے ساتھ باغیوں کا سا سلوک کرتے اور ان کو بزورِ شمشیر اطاعت پر مجبور کرتے۔ مگر انھوں نے ان سے مصالحت کی گفتگو کی اور ان کے معاملہ میں خدا کا حکم چھوڑ کر انسانوں کو فیصلہ کا اختیار دیا، لہٰذا وہ بھی کافر ہوئے۔

اس لیے حضرت علی اور حضرت معاویہ دونوں کافر ہیں۔ جو لوگ ان کے ہم خیال

ہوں وہ بھی کافر ہیں۔ ان کا خون ہمارے لیے حلال ہے۔ انھوں نے طے کیا کہ ہم پہلے ان دونوں سے جنگ کریں گے۔ پھر فتح حاصل کرنے کے بعد، قرآن کے احکام کے مطابق اسلامی نظام قائم کریں گے۔ لہٰذا انھوں نے کوفہ و بصرہ میں قتل و غارتگری شروع کر دی۔ ان کے اعزہ و احباب کی بھی ایک جماعت ان کے ساتھ شریک ہو گئی۔ حضرت علی نے ان کو سمجھانے کے لیے حضرت عبداللہ بن عباس کو بھیجا، جب وہ نہ مانے تو خود تشریف لے گئے اور ان کو سمجھایا کہ میں نے تو تمہارے ہی اصرار پر جنگ روکی اور قرآن کی روشنی میں تحکیم کو منظور کیا۔ میں نے حکمین کو قرآن کے مقابلہ میں اپنی رائے سے فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں دیا تھا بلکہ قرآن ہی کے حکم کے اعلان و اظہار کا حق دیا تھا۔ آخر قرآن خود تو بولنے سے رہا۔ اب حکمین کا فیصلہ آگیا ہے۔ انھوں نے چونکہ قرآن کے حکم کے خلاف فیصلہ دیا ہے لہٰذا میں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ یوں وہ بات ہی جو تمہارے اختلاف کی بنیاد ہے، ختم ہو گئی۔

مگر وہ نہ مانے اور انھوں نے کہا کہ آپ پہلے تسلیم کیجیے کہ تحکیم کو قبول کر کے آپ نے کفر کا ارتکاب کیا، پھر اپنی توبہ کا اعلان کیجیے۔ ہم نے بھی ایسا ہی کیا ہے تب ہم آپ کے ساتھ ہوں گے اور معاویہ سے جنگ کریں گے۔

الغرض یہ لوگ کسی دلیل و حجت سے قائل نہ ہوئے۔ اور کوفہ و بصرہ اور اطراف میں فساد پھیلاتے رہے۔ ویسے بڑے متقی اور پرہیزگار بنتے تھے۔ نیچے نیچے کرتے پہنتے تھے۔ لمبی لمبی نمازیں پڑھتے تھے۔ ان کے ہاتھوں پر گٹے پڑ گئے تھے اور کہنیاں کھردری ہو گئی تھیں۔ قرآن کریم کی تلاوت میں لگے رہتے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق قرآن کریم ان کے حلق سے نیچے نہ اترتا تھا۔

بخاری شریف میں حضرت علی سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"(صحابۂ کرام کے) آخری زمانہ میں کچھ لوگ نکلیں گے جو جواں عمر ہوں گے، کم عقل ہوں گے۔ قرآنِ کریم اور حدیث ان کی زبانوں پر جاری ہوگی۔ مگر ان کا ایمان اور قرآن ان کے نرخروں سے نیچے نہ اترے گا۔ وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر نشانہ کے پار ہو جاتا ہے۔ تم اُن لوگوں کو جہاں پاؤ قتل کرو۔ جو شخص ان کو قتل کرے گا اسے قیامت کے دن ثواب ملے گا۔"[1]

مورخین نے ان کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ان کا ایک گروہ جا رہا تھا کہ راستہ میں ان کو حضرت عبداللہ بن خبّاب ایک تابعی بزرگ ملے۔ ان کی بیوی ان کے ساتھ تھی۔ انھوں نے ان کو پکڑ لیا اور ان سے پوچھا: تم کون ہو؟ انھوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مشہور ساتھی حضرت خباب کے بیٹے عبداللہ۔ خارجیوں نے کہا ہمیں کوئی حدیث سُنائیے جو آپ کے والد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو۔ عبداللہ نے ان کو حدیث سنائی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عنقریب ایک فتنہ برپا ہوگا جس میں بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے بہتر ہوگا اور کھڑا ہونے والا چلنے والے سے بہتر ہوگا۔ اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہوگا۔"

ان لوگوں نے ان کو ساتھ لے لیا اور کہا آپ ڈریے نہیں۔

راستہ میں ایک سُوَر ملا۔ ایک شخص نے اس کو زخمی کر دیا۔ سب نے اسے ملامت کی۔ وہ ایک ذمی کا تھا۔ اسے تاوان دے کر راضی کیا گیا۔ پھر آگے بڑھے تو ایک شخص نے زمین پر پڑی ہوئی ایک کھجور منہ میں رکھ لی۔ سب نے اسے بھی ملامت کی۔ اس نے کھجور کو اگل دیا۔

مگر عبداللہ بن خبّاب کو جن کے متعلق ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ان کے ہم خیال

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۱۰۲۴ باب قتال الخوارج۔

نہیں ہیں، ذبح کر دیا۔ پھر ان کی حاملہ بیوی کا بھی پیٹ پھاڑ ڈالا۔

حضرت علی اور ان کے ساتھیوں کو جو ابھی کوفہ میں تھے اور شام کی طرف کوچ کرنے کی تیاری کر رہے تھے، یہ واقعات معلوم ہوئے تو حارث بن مرہ کو حالات کی تحقیق کے لیے ان کی طرف بھیجا۔ ان خارجیوں نے ان کو بھی قتل کر دیا۔

اب حضرت علی کے لشکریوں نے ان سے کہا کہ اگر ہم شام چلے گئے تو یہ ہمارے پیچھے ہمارے اہل و عیال کو قتل کر دیں گے اور ہمارے گھر بار کو لوٹ لیں گے۔ اس لیے پہلے ان سے نمٹ لینا ضروری ہے۔ حضرت علی نے اس رائے سے اتفاق کیا۔

خارجی کوفہ، بصرہ، انبار اور دوسرے شہروں سے نکل کر نہروان میں جمع ہو گئے تھے۔ انھوں نے عبداللہ بن وہب راسبی کو اپنا امیر بنا لیا تھا۔ حضرت علی اپنی فوج کو لے کر نہروان پہنچے۔

حضرت علی نے پھر ایک مرتبہ ان کو سمجھایا۔ ان میں سے کچھ لوگ تو راہِ راست پر آ گئے اور ان سے آن ملے۔ مگر تقریباً چار ہزار عبداللہ بن وہب راسبی کی سرداری میں مقابلہ پر صف آرا ہوئے۔ حضرت علی نے اپنی فوج کو میمنہ اور میسرہ دو حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ خارجی ان دونوں ٹکڑیوں کے درمیان گھس گئے۔ اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ لڑے۔ ان کی جاں بازی کا یہ حال تھا کہ ایک شخص شُریح کا ایک پاؤں کٹ گیا تو صرف ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر تلوار چلاتا رہا۔ مگر حضرت علی کے ساتھیوں نے بھی پوری طاقت سے مقابلہ کیا، اور حریف کی پوری جماعت کا صفایا کر دیا۔

نہروان کی لڑائی میں خارجیوں کو شکستِ فاش ہوئی۔ مگر ان کے ہم عقیدہ عراق کے مختلف مقامات پر ابھی موجود تھے۔ پھر ان کے رشتہ دار بھی تھے جن کو ان سے ہمدردی تھی۔ اس لیے یہ جماعت ختم نہیں ہوئی۔ اور عرصہ تک حضرت علی اور دوسرے حکمرانوں کو پریشان کرتی رہی۔

شام کا ارادہ اور اُس کا التوا

معرکۂ نہروان سے فراغت کے بعد، حضرت علی نے اپنے لشکر کو شام کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا، تاکہ اپنے اصل حریف حضرت معاویہ کا مقابلہ کریں۔ مگر ان کے لشکر کے سرداروں نے کہا:

اے امیرالمومنین، ہمارے ترکش خالی ہوگئے ہیں، ہماری تلواریں مُڑ گئی ہیں اور ہمارے نیزے ٹوٹ گئے ہیں۔ ہمیں اجازت دیجیے کہ ہم کوفہ جاکر سامانِ جنگ درست کریں اور نہروان میں ہماری طاقت کو جو نقصان پہنچا ہے اس کا تدارک کریں۔

حضرت علی ان لوگوں کو ساتھ لے کر کوفہ کے قریب نخیلہ میں مقیم ہوئے اور حکم دیا کہ کوئی شخص کوفہ میں نہ داخل ہو اور جو کچھ تیاری کرنی ہے یہیں کرلی جائے۔ مگر یہ لوگ ایک ایک کرکے کھسکنے لگے۔ چند روز بعد نخیلہ لشکر سے خالی ہوگیا۔ صرف خاص خاص حضرت علی کے حامی باقی رہ گئے۔

آخر حضرت علی بھی کوفہ چلے آئے۔ اور اپنے کمزور ساتھیوں کو سمجھانے اور پُرجوش خطبوں سے ان کے افسردہ دلوں کو گرمانے کی کوشش کی۔ اس دوران جامع کوفہ میں انھوں نے جو تقریریں کی ہیں ان میں آپ نے اپنے دل کے زخم کھول کر رکھ دیے ہیں۔

علامہ شریف رضی نے نہج البلاغہ میں، جو شیعہ فرقہ کی مستند کتاب ہے، ان خطبوں کو جمع کردیا ہے۔ جامع کوفہ کے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں:

"اے اہلِ کوفہ! افسوس صد افسوس، جب میں تم سے جاڑوں میں لڑنے کے لیے نکلنے کے واسطے کہتا ہوں تو تم کہتے ہو کہ ایسے سخت جاڑے میں کیسے نکلیں اور جب میں تم کو گرمیوں میں جنگ کا حکم دیتا ہوں تو تم کہتے ہو ایسی شدید گرمی میں جنگ نہیں ہوسکتی۔ جب تم گرمی اور سردی سے بھاگتے ہو تو تلوار کے سامنے کیا ٹھہر سکو گے۔ کاش میرا واسطہ تم لوگوں سے نہ پڑا ہوتا۔ تم نے میرے

سینہ کو غیظ و غضب سے بھر دیا ہے۔ تم نے میری نیک نامی کو بٹہ لگا دیا ہے۔
اب تو میری دُعا یہ ہے کہ اللہ مجھے تمہارے درمیان سے نکال دے اور اپنے
آغوشِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے"

مگر حامیانِ علی پر اِن تقریروں کا کچھ اثر نہ ہوا۔ آخر مجبوراً آپ نے شام کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

اہلِ کوفہ کی بددلی کے اسباب

اہلِ کوفہ کی اس افسردگی اور بددلی اور جنگ سے انکار و فرار کی کچھ وجوہات بھی تھیں۔ مصر کے عہدِ حاضر کے مورّخ طٰہٰ حسین نے ان پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:

معرکۂ نہروان میں جو خارجی شمشیرِ حیدری کا شکار ہوئے وہ اہلِ کوفہ و بصرہ ہی تھے۔ کوفہ کے حضرت علی کے یار و مددگار ان کے اَعِزّہ و احباب ہی تھے۔ ان کو اس بات کا غم تھا کہ ان کی تلواروں سے غیروں کا نہیں اپنوں کا ہی خون بہا ہے۔

پھر ان مسلسل جنگوں سے انھیں کوئی مالی فائدہ بھی نہیں تھا۔ حضرت علی ان لڑائیوں کو مسلمانوں کے باہمی اختلاف کی حیثیت دیتے تھے، اسلام اور کفر کا مقابلہ نہیں سمجھتے تھے۔ نہ وہ مالِ غنیمت لوٹنے کی اجازت دیتے تھے اور نہ مفتوحین کو غلام باندی بنانے کی۔

حضرت علی خود بھی زاہدانہ اور مُتّقیانہ زندگی بسر کرتے تھے اور دوسروں کو بھی تقویٰ، دیانت اور پاکبازی کی زندگی بسر کرنے کا حکم دیتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو اُس زندگی کی طرف لے جائیں جس کے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر و عمر کے زمانہ میں خوگر تھے۔ مگر اب وہ نسل ختم ہو گئی تھی اور نئی نسل پیدا ہو گئی تھی۔ حضرت عمر کے زمانہ کی ایرانی و رومی فتوحات کے نتیجہ میں ایران و روم کے خوش منظر اور دل رُبا تمدّن نے عربوں کی نئی نسل کو بھی مسحور کر دیا تھا۔ اب ان کو شیخین کے زمانہ کی سادہ اور بے کیف زندگی

کی طرف واپس لانا ممکن نہ تھا۔

دوسری طرف ان کے حریف حضرت معاویہ تھے، جو رومی شہروں کے پڑوس میں مقیم تھے اور وہ رومیوں کو بتا دینا چاہتے تھے کہ وہ دنیوی شان و شوکت اور ظاہری آن بان میں بھی ان سے کم نہیں ہیں۔ وہ مال و دولت کو شجرۂ ممنوعہ نہیں سمجھتے تھے اور عراقی سرداروں کو بھی بڑی بڑی رقمیں دے کر خفیہ طور پر اپنا حامی اور ہمدرد بناتے رہتے تھے۔

حالات کا یہ نقشہ تھا جس کے نتیجہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی حامیانِ علی جنگ سے گریز کرتے ہیں اور کوفہ میں امن و عافیت سے بیٹھ کر دونوں طرف سے جو کچھ مل جائے اس پر قناعت کرنا بہتر سمجھتے ہیں۔

حضرت معاویہ کی پیش قدمی

حضرت علی کے ساتھیوں کی بے وفائی اور غدّاری اور اپنے حق میں حالات کی ساز گاری سے حضرت معاویہ نے پورا فائدہ اٹھایا۔ پہلے انھوں نے مصر پر قبضہ کیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے :

مصر پر قبضہ حضرت علی نے زمامِ خلافت ہاتھ میں لینے کے بعد جب عہدِ عثمانی کے حاکموں اور عاملوں کو معزول کیا تو مصر کا گورنر قیس بن سعد انصاری کو مقرر کیا تھا۔ وہ ایک مُدبّر اور با اثر شخصیت تھے۔ انھوں نے مصر پہنچ کر حالات کو درست کیا اور سارے ملک کو نئے خلیفہ کا مطیع و فرماں بردار بنا لیا۔ صرف علاقہ خربتا کے عثمانیوں نے کہا کہ ابھی ان سے بیعت لینے پر اصرار نہ کیا جائے۔ تاہم وہ والیِ مصر کی اطاعت کریں گے اور ملک میں فتنہ و فساد نہ پھیلائیں گے۔ قیس نے ان کی یہ بات منظور کر لی، اور اہلِ خربتا بھی اپنے وعدہ پر قائم رہے۔

حضرت معاویہ نے قیس کو توڑنے کے لیے ان سے نامہ و پیام شروع کیا مگر انھوں نے عہد شکنی سے صاف انکار کر دیا۔

اِدھر حضرت علی کو بعض لوگوں نے بہکایا کہ قیس معاویہ سے ساز باز کر رہے ہیں اور اسی وجہ سے اہلِ خربتا ان کے ساتھ ہیں۔ حضرت علی نے قیس کی وفاداری کا امتحان لینے کے لیے ان کو حکم دیا کہ وہ اہلِ خربتا سے بیعت لیں اور اس میں دیر نہ کریں۔ قیس بن سعد ایک مخلص مگر خود دار آدمی تھے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ حضرت علی ان کے طرزِ عمل کو مشکوک سمجھ رہے ہیں تو انھوں نے ولایتِ مصر سے استعفا دے دیا۔

حضرت علی نے ان کی جگہ محمد بن ابو بکر کو والیِ مصر بنا کر بھیجا۔ انھوں نے مصر

پہنچ کر فوراً اہلِ خربتا سے حضرت علی کی بیعت کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے ان سے بھی مہلت مانگی مگر محمد بن ابو بکر نے مہلت دینے سے انکار کر دیا اور ایک فوجی دستہ ان کے مقابلہ کے لیے روانہ کر دیا۔

اسی دوران معرکۂ صفین شروع ہو گیا۔ دونوں فریق اس کے نتیجہ کے انتظار میں رُکے رہے۔ معرکۂ صفین کے بعد اہلِ خربتا کے حوصلے بلند ہو گئے۔

اہلِ خربتا دس ہزار کی تعداد میں تھے۔ ان میں بسر بن ارطاۃ، مسلمہ بن مخلد اور معاویہ بن خدیج جیسے بہادر جنگ آزما شامل تھے۔ محمد بن ابو بکر کے بھیجے ہوئے دستۂ فوج کو انھوں نے شکست دے دی۔ محمد بن ابو بکر نے پھر دوسرا دستہ بھیجا جو اس سے زیادہ طاقتور تھا، مگر اہلِ خربتا نے اسے بھی مار بھگایا۔ ان شکستوں سے مصر کے حالات بگڑ گئے اور حکومت کا وقار جاتا رہا۔ حضرت علی کو یہ خبریں ملیں تو انھوں نے اپنے خاص معتمد اور جاں نثار مالک بن اشتر کو، جو جزیرہ کے والی تھے، مصر کا والی بنا کر روانہ کیا۔ مگر وہ ابھی مصر کے راستہ ہی میں تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کو زہر دے دیا گیا۔ حضرت علی نے محمد بن ابو بکر کو لکھا کہ وہ مصر کا انتظام کرتے رہیں۔

واقعۂ تحکیم کے بعد جب حضرت معاویہ نے اپنی قوت اور طاقت میں اضافہ کر لیا تو مصر پر قبضہ کا فیصلہ کیا۔ اور اپنے خاص حامی عمرو بن عاص کو چھ ہزار سپاہیوں کے ساتھ مصر روانہ کیا۔ اہلِ خربتا نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ محمد بن ابو بکر نے حضرت علی کو اطلاع دی اور خود دو ہزار کا لشکر لے کر مقابلہ کے لیے نکلے۔ حضرت علی جن حالات میں گرفتار تھے اس کی وجہ سے فوراً کوئی مدد نہ کر سکے۔ محمد بن ابو بکر نے شکست کھائی اور جان بچا کر بھاگ نکلے۔ انھوں نے ایک ویران کھنڈر میں پناہ لی جہاں عمرو بن عاص کے لشکر نے ان کو جا پکڑا۔ اس لشکر میں عبدالرحمٰن بن ابی بکر بھی تھے، انھوں نے اپنے بھائی کی جان بچانے کی کوشش کی۔ مگر سردارِ اہلِ خربتا معاویہ بن خدیج نے حضرت عثمان کے قصاص میں ان کو قتل کر دیا۔

حضرت عائشہ کو اپنے بھائی کے قتل کی خبر ملی تو بہت رنجیدہ ہوئیں اور ان کے بچوں کو پرورش کے لیے اپنی تحویل میں لے لیا۔

اب مصر پر پورے طور پر حضرت معاویہ کا قبضہ ہو گیا۔ اس سے اُن کی طاقت میں بہت اضافہ ہوا اور ان کی ہمت بھی بڑھ گئی۔ یہ واقعہ ۳۸ھ کا ہے۔

حجاز و یمن وغیرہ پر حملے

اس کے بعد حضرت معاویہ نے مختلف صوبوں میں چھاپہ مار فوجی دستے روانہ کیے جنھوں نے حضرت علی کے افسروں کو شکست دے کر ان علاقوں پر قبضہ کر لیا یا کم از کم انتظامِ حکومت کو درہم برہم کر کے وہاں بدامنی پھیلا دی۔

چنانچہ نعمان بن بشیر کو عین التمر کی طرف ایک دستۂ فوج دے کر روانہ کیا۔ وہاں کی چھاؤنی پر مالک بن کعب متعین تھے۔ انھوں نے حضرت علی سے مدد طلب کی۔ مگر وہ کچھ مدد نہ کر سکے، اور نعمان بن بشیر کا عین التمر پر قبضہ ہو گیا۔

سفیان بن عوف کو چھ ہزار کی جمعیت دے کر انبار، مدائن اور ہیت کی طرف روانہ کیا۔ وہ وہاں کے بیت المال کو لوٹ کر واپس آئے۔ حضرت علی نے خود ان کا پیچھا کیا مگر ناکام رہے۔

عبد اللہ بن مسعدہ فزاری کو تیما کی طرف روانہ کیا۔ حضرت علی نے مسیب بن نجیہ فزاری کو ان کے مقابلہ کے لیے بھیجا۔ دونوں لشکروں میں سخت جنگ ہوئی۔ مسیب نے ان کو فرار کا موقع دے دیا۔

ضحاک بن قیس کو مضافاتِ بصرہ پر حملہ کے لیے روانہ کیا۔ انھوں نے وہاں لوٹ مار کی۔

بسر بن ارطاۃ کو تین ہزار کی جمعیت دے کر حجاز اور یمن کی طرف روانہ کیا۔ اس نے بغیر مقابلہ کے حجاز پر قبضہ کر لیا اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے لوگوں سے حضرت معاویہ کے لیے بیعت لی۔ پھر بسر بن ارطاۃ یمن پہنچا۔ وہاں کے عامل حضرت علی کی طرف سے عبید اللہ بن عباس تھے۔ وہ مقابلہ کی طاقت نہ پا کر حضرت علی سے

مدد لینے کوفہ چلے گئے۔ بسر نے یمن پر قبضہ کر لیا اور بڑی بے رحمی کے ساتھ عبید اللہ بن عباس کے دو چھوٹے بچوں کو قتل کر دیا۔

حضرت علی اپنوں اور غیروں کے ہاتھوں ان مصائب میں گرفتار تھے کہ ان کے چچا زاد بھائی اور ان کے دست راست حضرت عبد اللہ بن عباس نے بھی ان سے علیحدگی اختیار کر لی۔ وہ ان کی طرف سے ولایتِ بصرہ پر مامور تھے۔ حضرت علی نے ان پر بیت المال میں غلط تصرف کا الزام لگایا تھا۔ وہ گورنری سے استعفاء دے کر مکہ معظمہ چلے گئے۔ حضرت علی کو اس کا بہت رنج ہوا۔

مایوسی اور ناکامی کی ان اندھیریوں میں بھی، حیدرِ کرّار کی ہمتِ مردانہ کا چراغ روشن رہا۔ وہ جہاں تک ہو سکا حضرت معاویہ کے حملوں کی مدافعت کرتے رہے، اور ان کے مرکزِ حکومت شام پر حملہ کے لیے کوفہ والوں کو آمادہ کرنے کے لیے جامعِ کوفہ میں پُرجوش تقریریں کرتے رہے۔

ایک تقریر میں آپنے اہلِ کوفہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"میں تمہاری باتوں اور تنقیدوں سے اُکتا گیا ہوں۔ مجھے بتاؤ تم کیا کرنا چاہتے ہو۔ اگر تم کو میرے ساتھ دشمن کے مقابلہ کے لیے چلنا ہے تو فبہا۔ اور اگر نہیں چلنا ہے تو صاف صاف بتا دو تاکہ میں آخری فیصلہ کروں۔

خدا کی قسم اگر تم سب میرے ساتھ دشمن سے آخری مقابلہ کے لیے نہ نکلے تو میں تمہارے لیے بد دعا کروں گا۔ پھر اکیلا نکل کھڑا ہوں گا خواہ میرے ساتھ دس آدمی ہوں۔"

حضرت علی کی مایوسی حضرت علی کی ان ولولہ انگیز تقریروں سے کوفیوں کے جسمِ مُردہ میں وقتی طور پر جھرجھری پیدا ہوتی مگر پھر وہ افسردگی اور مُردگی کا شکار ہو جاتے۔ حضرت علی اِن مایوس کُن اور تکلیف دہ حالات میں گرفتار تھے کہ تقدیرِ الٰہی کے ایک فیصلہ نے ان کو مصائب سے آزاد کر دیا۔

شہادتِ علی مرتضیٰ

حضرت معاویہ کی مسلسل کامیابیوں نے ان کی جُرأت و ہمّت کو اور بڑھا دیا۔ انھوں نے ایسی تدبیریں شروع کیں جن سے عالمِ اسلام میں ان کو امیرالمومنین کی حیثیت حاصل ہو جائے۔

جب تک حجاز پر حضرت علی کا اقتدار و تسلط تھا اُن کی ہی طرف سے حج کے موقع پر امیرالحج مقرر ہوا کرتا تھا۔

۳۹ھ کے حج کے موقع پر حضرت معاویہ نے جن کا اب وہاں اقتدار تھا، یزید بن شجرہ رہاوی کو اپنی طرف سے امارتِ حج کا پروانہ دے کر بھیجا۔ حضرت علی نے قثم بن عباس کو امیرالحج مقرر کیا۔ کچھ لوگ اِن کے اور کچھ اُن کے طرف دار ہو گئے۔ آخر یہ طے پایا کہ شیبہ بن عثمان حجبی امارتِ حج کے فرائض ادا کریں۔ چنانچہ ان کی اِمارت میں اس سال کا حج ادا کیا گیا۔

اس حج میں خوارج کی بھی ایک جماعت شریک تھی۔ انھوں نے ایک خُفیہ اجتماع کر کے معرکۂ نہروان کے مقتولین پر اظہارِ رنج و غم کیا اور کہا یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے راہِ خدا میں بے دریغ اپنی جانیں قربان کیں۔ ہم کو ان کا خون رائگاں نہ جانے دینا چاہیے۔ پھر کہا، عالمِ اسلام میں اس وقت جو افراتفری مچی ہوئی ہے، حتیٰ کہ حرمِ محترم میں بھی امن و امان مفقود ہے۔ اس کے ذمہ دار تین شخص ہیں: علی، معاویہ اور عمرو بن عاص۔ اگر ان کو ٹھکانے لگا دیا جائے تو ملک میں امن قائم ہو جائے گا اور مسلمان کوئی مُتفقہ جماعتی نظام قائم کر سکیں گے، اور اپنے مقتولین کے انتقام کی جو آگ ہمارے دل میں بھڑک رہی ہے وہ بھی ٹھنڈی ہو جائے گی سب نے اس رائے سے اتفاق کیا اور تین شخصوں نے اس کی ذمہ داری قبول کی:

عبدالرحمٰن بن ملجم حمیری نے کہا میں علی کو ٹھکانے لگا دوں گا۔ برک بن عبداللہ نے کہا، میں معاویہ کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ عمرو بن بکر تمیمی نے کہا، عمرو بن عاص کو میں قتل کر دوں گا۔ اس کام کے لیے ۱۷ رمضان ۴۰ھ کی تاریخ بھی طے ہو گئی اور نمازِ فجر کا وقت بھی۔

چنانچہ ابن ملجم کوفہ آیا اور وقتِ مقررہ کا انتظار کرنے لگا۔ یہاں جامع کوفہ میں ابن ملجم کی ایک حسین خارجی عورت قطام بنت الشجنہ سے آنکھ لڑ گئی۔ ابن ملجم نے اس کو نکاح کا پیغام دیا۔ قطام کے باپ اور بھائی معرکۂ نہروان میں قتل ہو چکے تھے، اور وہ ان کے انتقام کے لیے بے چین تھی۔ اس نے حضرت علی کا سر اور تین ہزار درم اور ایک غلام اور ایک باندی مہر مانگا۔ ابن ملجم نے بخوشی قبول کیا، اور قطام کو بتایا کہ وہ تو حضرت علی کے قتل کے ارادہ سے ہی کوفہ آیا ہے۔ قطام نے دو اور شخصوں کو اس کی مدد کے لیے آمادہ کر دیا۔

۱۷ رمضان کی رات کو ابن ملجم اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ جامع کوفہ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ جیسے ہی صبح کی پو پھٹی، حضرت علی مسجد میں داخل ہوئے۔ پہلے لوگوں کو نماز کے لیے جگایا۔ پھر نماز پڑھانے کے لیے محراب میں قدم رکھا، ابن ملجم اور اس کے ساتھیوں نے آپ پر تلوار کے پے در پے وار کیے اور نعرہ لگایا: "اے علی حکم اللہ ہی کا چلتا ہے تمہارا نہیں"، حضرت علی چکرا کر محراب میں گرے اور آپ کی گردن اور ڈاڑھی خون میں شرابور ہو گئی۔ آپ نے پکار کر کہا "قاتل کو پکڑو"، ابن ملجم کو پکڑ لیا گیا مگر اس کے دونوں ساتھی بھاگ نکلے۔

حضرت علی کو گھر لایا گیا۔ تلوار زہر میں بجھی ہوئی تھی پھر زخم بھی سر اور گردن کا تھا۔ آپ کی حالت نازک ہوتی چلی گئی۔

آپ نے اپنے صاحبزادوں حضرت حسن و حضرت حسین کو بلایا اور ان کو اللہ سے ڈرنے، نماز، روزہ، زکوٰۃ کی پابندی، عزیزوں سے بہتر سلوک اور عام مسلمانوں کی خیر خواہی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی وصیت کی۔ ابن ملجم قاتل

سامنے لایا گیا تو فرمایا: اگر میں مرجاؤں تو صرف اُسے قتل کر دینا۔ اور اگر زندہ رہ گیا تو پھر میں خود اس کی سزا تجویز کروں گا۔

پھر آپ کی زبان پر کلمۂ طیبہ جاری ہوگیا۔ آخر اِدھر آفتاب نے پردۂ شب میں مُنہ چھپایا اُدھر آپ نے دُنیا سے کنارہ فرمایا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔

اسی تاریخ کو اسی وقت برک بن عبداللہ نے جامع دمشق میں مسجد سے نکلتے ہوئے حضرت معاویہ پر حملہ کیا۔ مگر وار اوچھا پڑا۔ اور آپ معمولی طور پر زخمی ہوئے۔ عمرو بن ابوبکر نے مصر میں عمرو بن عاص پر حملہ کا پروگرام بنایا۔ مگر وہ ناسازیِ طبع کی وجہ سے اس روز خود نہ آئے بلکہ قاضی مصر خارجہ بن حذافہ نماز پڑھانے آئے۔ خارجی نے عمرو بن عاص سمجھ کر ان پر حملہ کیا اور وہ مقتول ہوئے۔

خاندانِ علیِ مرتضیٰ

حضرت علی مرتضیٰ نے متعدد بیویوں سے شادیاں کیں۔ ان کے علاوہ آپ کی کئی باندیاں بھی تھیں۔ ان سب سے چودہ لڑکے اور سترہ لڑکیاں پیدا ہوئیں تفصیل یہ ہے:

(۱) جگر گوشۂ رسول، خاتونِ جنت حضرت فاطمہ زہرا۔ جب تک وہ زندہ رہیں آپ نے کسی اور سے شادی نہ کی۔ ان سے تین صاحبزادے، حسن، حسین اور محسن پیدا ہوئے، اور دو صاحبزادیاں زینبِ کبریٰ اور اُمِّ کلثوم کبریٰ پیدا ہوئیں۔ محسن بچپن ہی میں وفات پا گئے تھے۔

بقیہ کی تفصیل یہ ہے:

(۲) ام البنین بنت حزام عامریہ۔ ان سے چار فرزند عباس، جعفر، عبداللہ اور عثمان پیدا ہوئے۔ عباس کے علاوہ سب میدانِ کربلا میں کام آئے۔

(۳) لیلیٰ بنت مسعود تمیمیہ۔ ان سے دو فرزند عبیداللہ اور ابوبکر پیدا ہوئے۔

(۴) اسماء بنت عمیس خثعمیہ۔ ان سے یحییٰ اور محمد اصغر پیدا ہوئے۔

(۵) صہبار بنت ربیعہ حبشیہ۔ یہ اُمِّ ولد تھیں۔ ان سے عمر اور رُقیہ پیدا ہوئے۔

(۶) امامہ بنت ابوالعاص۔ یہ حضرت زینب کی بیٹی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نواسی تھیں۔ ان سے محمد اوسط پیدا ہوئے۔

(۷) خولہ بنت جعفر حنفیہ۔ ان سے محمد ابن حنفیہ پیدا ہوئے۔

(۸) ام سعید بنت عروہ بن مسعود۔ ان سے ام الحسین اور رملہ کبریٰ پیدا ہوئیں۔

(۹) محیاۃ بنت امرء القیس۔ ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئیں جو بچپن میں ہی

انتقال کر گئیں۔

ان کے علاوہ آپ کی کئی باندیاں بھی تھیں۔ ان سے حسبِ ذیل لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ان کے نام یہ ہیں:

ام ہانی، میمونہ، زینب صغریٰ۔ رملہ صغریٰ۔ ام کلثوم صغریٰ، فاطمہ، امامہ، خدیجہ، ام الکرام، ام سلمہ، ام جعفر، جمانہ، نفیسہ۔

مگر آپ کی نسل صرف پانچ صاحبزادوں حضرات حسن، حسین، محمد بن حنفیہ، عباس اور عمر سے چلی۔

عہدِ خلافت کے کارناموں پر

ایک نظر

حضرت علی نے زمامِ خلافت ہاتھ میں لی، تو پورا عالمِ اسلام بدامنی، ہنگامہ آرائی، خانہ جنگی اور افراتفری کی آماجگاہ تھا۔ خود مرکزِ اسلام مدینہ منورہ پر شورش پسندوں اور مفسدوں کا قبضہ تھا۔ کسی کی عزت و آبرو محفوظ نہ تھی۔ اکابر صحابہ تک یا تو مدینہ منورہ کو چھوڑ کر چلے گئے تھے یا اپنے گھروں میں دروازے بند کرکے بیٹھے ہوئے تھے۔ خود خلیفۃ المسلمین کو شورش پسندوں نے روزِ روشن میں انتہائی ظلم و سفاکی سے شہید کر دیا تھا۔ اور ان کی لاش تین روز تک بے گور و کفن پڑی رہی تھی۔

اِن حالات میں حضرت علی کی بیعت ہوئی۔ بیعت کے بعد بھی مفسد اور شر پسند اُن کو گھیرے رہے۔ اور ان کو اتنا موقع نہ دیا کہ وہ ملّت کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو مجتمع کر سکیں اور ملک میں امن و امان کی فضا قائم ہو۔ ان کی سازشوں کے نتیجہ میں فرزندانِ توحید ایک دوسرے کی گردنیں کاٹتے رہے۔ اور مسلمانوں کی تلواریں آپس ہی میں ٹکراتی رہیں۔ ان معرکوں میں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد کام آئی کہ اب تک پوری تاریخِ اسلام کے جہادوں میں کام نہ آئی تھی۔

ان حالات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پنج سالہ عہدِ خلافت میں اسلامی حدودِ مملکت میں اضافہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اس میں شک نہیں کہ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر نے جب عنانِ خلافت ہاتھ میں لی تو

اس وقت بھی، نبوت کے جھوٹے دعویداروں، زکوٰۃ کے منکروں اور منافقوں نے عالمِ اسلام کو اضطراب و انتشار میں مبتلا کر رکھا تھا۔ مگر اس وقت اکابرِ اُمّت متحد تھے اور بزرگانِ ملّت میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ حضرت علی کے عہد میں مفسدوں کی سازشوں نے بزرگانِ ملّت کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا تھا۔

زُہد و تقویٰ

حضرت علی نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دامانِ تربیت میں پرورش پائی تھی، اس لیے آپ کی زندگی بڑی زاہدانہ اور پرہیزگارانہ تھی۔ خلافت سے پہلے تو محنت و مزدوری کرکے پیٹ پالتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ عوالیِ مدینہ میں ایک بوڑھی عورت کا باغ سیراب کرنے کی مزدوری کی جس سے ہاتھوں میں آبلے پڑ گئے اور تھوڑی سی کھجوریں اُجرت میں ملیں۔ مگر خلافت کے بعد بھی، بیت المال سے بقدرِ کفاف ہی حق خدمت لیا اور وہی سادہ زندگی کا انداز باقی رہا۔ ایک دفعہ عبداللہ بن زریر نامی ایک صاحب کھانے میں شریک ہوئے۔ دسترخوان پر وہی معمولی سادہ کھانا تھا۔ عبداللہ نے کہا امیرالمومنین آپ کو پرندوں کے گوشت کا شوق نہیں ہے؟ فرمایا اے ابن زریر! خلیفۂ اسلام کو مسلمانوں کے مال میں سے صرف دو پیالے لینے کا حق ہے۔ ایک اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے اور دوسرا مہمانوں کے لیے۔

ایک دفعہ تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ میری تلوار کا خریدار کون ہے؟ خدا کی قسم اگر میرے پاس تہ بند کی قیمت ہوتی تو اسے فروخت نہ کرتا۔ ایک شخص نے عرض کیا امیرالمومنین میں تہ بند کی قیمت قرض دیتا ہوں۔

ابورافع بیت المال کے خازن تھے۔ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز انھوں نے بیت المال کا ایک موتی نکال کر آپ کی کسی صاحبزادی کی گردن میں ڈال دیا۔ آپ نے دیکھا تو پوچھا یہ کہاں سے آیا، یہ تو بیت المال کا معلوم ہوتا ہے؟ ابورافع کہتے ہیں: میں نے عرض کیا کہ امیرالمومنین اسے میں نے اپنی بھتیجی کی گردن میں ڈال دیا تھا۔ حضرت علی نے فرمایا: میں نے تو ارادہ کیا تھا کہ لڑکی کا

ہاتھ کاٹ دوں۔

اس زاہدانہ اور متقیانہ احتیاط کی وجہ سے آپ دوسروں کو بھی بیت المال سے غلط فائدہ نہ اٹھانے دیتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ان کے حقیقی بھائی عقیل بن ابی طالب نے بیت المال سے کچھ رقم طلب کی جس کے وہ مستحق نہ تھے۔ حضرت علی نے صاف انکار کر دیا اور فرمایا کہ اے بھائی، یہ مال میرا نہیں ہے، میں تو صرف اس کا محافظ اور امین ہوں۔ جب میرے پاس کچھ اپنا ہوگا تو تمہیں دے دوں گا۔ عقیل بن ابی طالب اس جواب سے ناراض ہوگئے اور حضرت معاویہ کے پاس شام چلے گئے۔ وہاں انھوں نے ان کو انعام واکرام سے لاد دیا۔

حضرت عبداللہ بن عباس سے زیادہ ان کا اپنا آدمی کون ہو سکتا تھا۔ وہ ان کے زمانہ میں بصرہ کے والی تھے۔ ان کو شبہ ہوا کہ انھوں نے بیت المال میں غلط تصرّف کیا ہے۔ حالانکہ اس وقت وہ اپنوں اور غیروں کی طرف سے سخت مشکلات میں مبتلا تھے مگر انھوں نے ان سے حساب طلب کر لیا۔ عبداللہ بن عباس کو ان کی بدگمانی سے ناگواری ہوئی اور استعفا دے کر مکہ معظمہ چلے گئے۔

ایک طرف حضرت علی کی بیت المال میں تصرف سے احتیاط اور عمّالِ حکومت سے احتساب کا یہ حال تھا، دوسری طرف حضرت معاویہ، دمشق کے محلّات میں بیٹھے ہوئے، بڑی فیاضی کے ساتھ اپنے حامیوں ہی پر نہیں، اپنے مخالفوں پر بھی دولت کی بارش کر رہے تھے۔ شیعہ مورخ فخری لکھتا ہے کہ "حجاز سے سردارانِ قریش مثلاً عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن جعفر، عبداللہ بن عمر، عبدالرحمٰن بن ابوبکر اور ابان بن عثمان، دمشق ان کے دربار میں آتے تھے اور ان سے سخت لہجہ میں گفتگو کرتے تھے اور مالی مدد طلب کرتے تھے۔ وہ ان سے لطف ومحبت کے ساتھ پیش آتے، ان کی خوب خاطر ومدارات کرتے اور رخصت کے وقت ان کو بیش قرار تحفوں اور انعامات سے لاد دیتے"۔

اب عرب معاشرہ کی حالت بھی بدل چکی تھی۔ مدینہ منورہ میں کچی جھونپڑیوں

کی بجائے شاندار محلات تعمیر ہو گئے تھے اور فارس و روم کی فتوحات نے عرب کے بدوؤں کو تکلفات کا عادی بنا دیا تھا۔ مال و دولت کو اب حقیر نہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ چیز ان کو حضرت علی کے پاس نہ ملتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آہستہ آہستہ ان کے حامی بھی ان سے علیحدہ ہو گئے اور حضرت معاویہ سے جا ملے۔ اور وہ تقویٰ و طہارت میں اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کے باوجود خلافت و حکومت کے معاملہ میں ناکام رہے۔

علمی و عملی کمالات

اسلامی تعلیمات کے محور قرآنِ کریم اور سنتِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کے مطالب و مقاصد بلکہ اسرار و حِکَم سے واقفیت کے بہترین مواقع ملے۔

آپ کو بچپن ہی سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی آغوشِ تربیت میں علمی و عملی کمالات حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اسی لیے زندگی کے تمام مسائل پر آپ کی نظر گہری تھی۔ چنانچہ ۱۰ھ میں جب یمن فتح ہوا تو آپ کو حضورؐ نے حالانکہ آپ نوجوان ہی تھے وہاں کا قاضی بنا کر بھیجا۔ حضرت علی نے کہا یا رسول اللہ آپ مجھے قاضی بنا کر بھیج رہے ہیں، حالانکہ میں ابھی جوان ہوں اور قضا (فصلِ مقدمات) کا مجھے کوئی تجربہ نہیں۔ اس پر حضورؐ نے ان کے سینہ پر ہاتھ پھیرا اور دعا کی کہ اے خدا اس کے قلب کو سیدھا راستہ دکھا اور اس کی زبان کو سنبھالے رکھ۔ حضرت علی کہتے ہیں بقسم خدا کی اس کے بعد مجھے کسی مقدمہ میں فیصلہ دیتے ہوئے تردد نہ ہوا۔ حضرت ابنِ مسعود کہتے ہیں کہ ہم صحابہ آپس میں کہا کرتے تھے کہ "ہم میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے علی ہیں"۔ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ "ہم میں بہترین فیصلہ کرنے والے علی ہیں اور بہترین قاری یا عالم اُبیؓ"۔ اسی لیے حضرت عمر، حضرت عثمان، بلکہ حضرت معاویہ بھی مشکل مسائل میں حضرت علی کی طرف رجوع کرتے تھے۔

سعید بن مسیّب کہتے ہیں کہ حضرت عمر دعا کرتے تھے کہ اے اللہ ہمارے سامنے کوئی ایسا پیچیدہ مسئلہ نہ آئے جسے ہم علی سے حل نہ کر سکتے ہوں۔

فقہی معلومات کے علاوہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر وقت کی صحبت سے آپ کو حاصل تھیں، حضورؐ کی دعا کی برکت سے آپ کو قوتِ اجتہاد و استنباطِ مسائل

میں بھی کمال حاصل تھا۔ تاریخ میں کئی عجیب و غریب اور دقیق مقدمات کے فیصلے ملتے ہیں جن کو پڑھ کر آپ کے فہم و تدبّر اور قوتِ فیصلہ کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

خطابت و شاعری

حسنِ تقریر اور قوتِ خطابت میں بھی آپ کو صحابۂ کرام میں ممتاز مقام حاصل تھا۔ دینی و اخلاقی اور سیاسی و اصلاحی موضوعات پر، بڑی برجستہ اور اثر انگیز تقریریں کرتے تھے۔ سیّد مرتضیٰ نے نہج البلاغہ میں آپ کے جو خُطبات جمع کیے ہیں اُن سے آپ کے زورِ بیان کا اندازہ ہوتا ہے۔ شعر و سخن سے بھی آپ کو دلچسپی تھی۔ آپ کے متعدّد رجزیہ اشعار، جنھیں آپ نے جہاد میں مجاہدین کے دلوں کو گرمانے کے لیے کہا، حدیث و سیرت کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ ایک دیوان اشعار بھی آپ کی طرف منسوب ہے مگر اس کی نسبت کی صحت کو اہلِ علم تسلیم نہیں کرتے۔

تصوّف

تصوف کا مقصد یہ ہے کہ اپنے اعمال میں اخلاص و للّٰہیت کی کیفیت پیدا کی جائے، اور اپنی زندگی کو شریعت کے سانچہ میں ڈھال لیا جائے۔ حدیثِ صحیح میں اسے اِحسان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کی تشریح یہ کی گئی ہے:

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ (صحیح البخاری)	تم اللہ کی عبادت یہ تصور کرتے ہوئے کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ کیونکہ اگرچہ تم اسے نہیں دیکھتے مگر وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔

یعنی آدمی کو یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی اس پر نظر ہے، اس لیے اپنی زندگی اس کے احکام کے مطابق بسر کرنی چاہیے اور ہر کام میں اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہونا چاہیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر وقت کی صحبت سے، اس علم میں آپ کو بلند مقام حاصل تھا۔ چنانچہ تصوف کے اکثر مشہور سلسلے آپ ہی کی ذات پر منتہی ہوتے ہیں۔

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ وَاَرْضَاہُ

خلافتِ حضرتِ حسنؓ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تدفین کے بعد، اہلِ عراق کوفہ کی جامع مسجد میں جمع ہوئے اور حضرت حسن کے ہاتھ پر بیعت کی۔

حضرت معاویہ کو جب حضرت علی کی شہادت اور حضرت حسن کی بیعت کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے شام میں دوبارہ اپنے ہاتھ پر بیعت کرائی، اور ساٹھ ہزار کا لشکر لے کر کوفہ کا ارادہ کیا۔ اپنی روانگی سے پہلے بطور مقدمۃ الجیش عبداللہ بن عامر بن کریز کو روانہ کیا۔ اس نے پہلے عین التمر پر قبضہ کیا پھر انبار پہنچ کر قیام کیا، اور مدائن پر حملہ کرنے کا انتظام کرنے لگا۔

حضرت حسن کو کوفہ میں اس کی خبر ملی تو وہ بھی چالیس ہزار کی فوج لے کر مدائن کی طرف روانہ ہوئے۔

ساباط پہنچ کر حضرت حسن کو اندازہ ہو گیا کہ ان کے ساتھیوں میں جنگ کے لیے گرم جوشی نہیں ہے اور لڑنے سے جان چُرا رہے ہیں۔ مگر اپنی طبعی فتنہ جوئی اور شر پسندی کے سبب صلح کے لیے بھی آمادہ نہیں ہیں۔

آپ نے وہاں اپنے اہلِ لشکر کو جمع کر کے حسبِ ذیل تقریر کی:

"لوگو، میں اپنے دل میں کسی مسلمان کی طرف سے کینہ نہیں رکھتا۔ مجھے تمھاری بہتری بھی اسی طرح ملحوظ ہے جس طرح اپنی۔ میں نے حالات کو دیکھ کر ایک رائے قائم کی ہے تم اس کی مخالفت نہ کرنا۔ اتحاد جسے تم ناپسند کرتے ہو اختلاف سے، جسے تم پسند کرتے ہو، بہتر ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میں سے اکثر لڑائی سے جان چُرا رہے ہیں۔ میں مناسب نہیں سمجھتا کہ تمھاری مرضی کے خلاف تم کو جنگ پر مجبور کروں"

حضرت حسن کی تقریر سنتے ہی لشکر میں ہنگامہ ہوگیا۔ ان میں جو لوگ خارجی ذہنیت کے تھے کہنے لگے، حسن بھی اپنے باپ کی طرح کافر ہوگئے ہیں۔ پھر یہ لوگ حضرت حسن کے خیمہ پر حملہ آور ہوئے۔ اور آپ کا تمام سامان لوٹ لیا۔ یہاں تک کہ آپ کے نیچے سے مصلّیٰ اور آپ کے کاندھے سے چادر بھی کھینچ لی۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت حسن نے اپنے مخلص حامیوں ربیعہ اور ہمدان کے قبیلوں کو آواز دی۔ انھوں نے ان ظالموں کے پنجہ سے ان کو چھڑایا۔

اب آپ مدائن کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں ایک خارجی جراح بن قبیصہ نے درختوں کی آڑ سے نکل کر آپ پر نیزہ سے حملہ کیا جس سے آپ زخمی ہو گئے۔ آپ کے ساتھیوں نے اسے قتل کر دیا۔ حضرت حسن مدائن پہنچ کر قصرِ ابیض میں مقیم ہوئے۔ زخم بھر جانے کے بعد، آپ حضرت معاویہ کے مقدمۃ الجیش کے افسر عبداللہ بن عامر کے مقابلہ کی تیاری کرنے لگے۔ اُدھر حضرت معاویہ خود اپنا لشکر لے کر انبار پہنچ گئے تھے۔ وہاں قیس بن سعد بن عبادہ، حضرت حسن کے ایک افسر موجود تھے۔ حضرت معاویہ نے ان کو محصور کر لیا۔ اور عبداللہ بن عامر کو حضرت حسن کے نام پیغامِ صلح دے کر مدائن کی طرف روانہ کیا۔

عبداللہ بن عامر مدائن پہنچے، تو حضرت حسن اپنی جمعیت لے کر ان کے مقابلہ کے لیے بڑھے۔ مگر عبداللہ نے باآوازِ بلند اعلان کیا، کہ میں لڑنے کے لیے نہیں بلکہ صلح کے لیے آیا ہوں۔ آپ کو میں خدا کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ اپنی اور اپنی جماعت پر رحم کیجیے۔ ڈر گئے، اپنے مختلف عاملوں کی شکست سے اور عراق سے دولت و مطلع ہوگئے ہیں۔

حضرت حسن فطرۃً نیک دل اور صلح پسند تھے۔ مسلمانوں کی خانہ جنگی آپ کو پسند نہ تھی۔ پھر اپنے حامیوں کی بزدلی اور بے وفائی نے بھی آپ کو برداشتہ خاطر کر دیا تھا۔ آپ نے حضرت معاویہ کی دعوتِ صلح کو قبول کر لیا اور عبداللہ بن عامر کی معرفت حسبِ ذیل شرائطِ صلح لکھ کر حضرت معاویہ کو بھیج دیں:

(۱) اہلِ عراق اور ان کے دوسرے ساتھیوں کو عام معافی دی جائے اور گزشتہ

معاملات پر کسی پرداروگیر نہ ہو۔

(۲) اہواز کا سالانہ خراج ان کو دیا جایا کرے۔

(۳) ان کے بھائی حضرت حسین کو سالانہ دو لاکھ درہم وظیفہ دیا جایا کرے۔

(۴) وظائف اور عطیات کے معاملہ میں بنی ہاشم کو دوسرے قبائل پر ترجیح دی جایا کرے۔

(۵) حضرت معاویہ کے بعد خلافت ان کو ملے۔

حضرت معاویہ اس جواب سے بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے اپنے قلم سے صلح نامہ لکھ کر ان شرائط کی منظوری دی اور اس پر اپنی مُہر لگائی۔ اور رؤسارِ شام کی گواہیاں کرائیں۔

حضرت حسن کو، عبداللہ بن عامر نے، حضرت معاویہ کی یہ تحریر پہنچائی اور حضرت حسن خلافت سے دستکش ہو گئے۔

اس کے بعد حضرت حسن کوفہ روانہ ہو گئے۔ جلد ہی حضرت معاویہ بھی کوفہ پہنچے۔ اور جامع کوفہ میں پہلے ان کے ہاتھ پر، حضرت حسن نے بیعت کی پھر تمام اہلِ کوفہ نے۔

اس طرح، مسلمانوں کی دس سالہ خانہ جنگی ختم ہو گئی۔ اور رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی حضرت حسن کے متعلق پوری ہوئی:

اِنَّ ابْنِیْ ھٰذَا سَیِّدٌ وَلَعَلَّ اللّٰہَ اَنْ یُّصْلِحَ بِہٖ بَیْنَ فِئَتَیْنِ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔	میرا بیٹا سردار ہے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کرائے گا۔

یہ واقعہ ربیع الاول ۴۱ھ کا ہے۔ اس سال کا نام عام الجماعۃ، اتحاد کا سال پڑ گیا۔

بارِ خلافت سے سبکدوش ہونے کے بعد، حضرت حسن مدینہ منورہ

تشریف لے گئے، اور اپنی بقیہ زندگی کے آٹھ سال، یکسوئی اور خاموشی کے ساتھ عبادت و ریاضت میں گذار دیے۔

آپ کے کچھ حامی اس صلح کو پسند نہ کرتے تھے اور آپ کو مخاطب کر کے کہتے یَا عَارَ الْمُؤْمِنِیْن اے مسلمانوں کے لیے باعثِ عار۔ آپ جواب دیتے: اَلْعَارُ خَیْرٌ مِّنَ النَّار عار دوزخ کی آگ سے بہتر ہے۔[۱] رضی اللہ تعالیٰ عنہ،

---

[۱] الاخبار الطوال دینوری ص ۲۱۵ / ۲۲۰ مطبوعہ مطبعۃ السعادۃ مصر و تاریخ الخلفاء سیوطی ص ۱۳۱

فقہ حنفی کی اہم ترین اور مستند کتابیں

(مولانا وقاری) محمد رفعت (صاحب) قاسمی

استاذ دارالعلوم دیوبند

مکمل ومدلل مسائلِ امامت	ائمہ اور امامتِ نماز سے متعلق تمام ضروری مسائل
〃 〃 مسائلِ تراویح	تراویح پڑھنے اور پڑھانے سے متعلق ضروری مسائل
〃 〃 مسائلِ روزہ	۲۳ ابواب پر مشتمل روزہ کے تمام ضروری مسائل
〃 〃 مسائلِ اعتکاف	اعتکاف سے متعلق تمام ضروری مسائل
〃 〃 مسائلِ نماز جمعہ	۱۰ ابواب پر مشتمل نماز جمعہ سے متعلق چار سو مسائل
〃 〃 مسائلِ شبِ برأت وشبِ قدر	شب برأت اور شب قدر کی مبارک راتوں سے متعلق مسائل
〃 〃 مسائلِ آدابِ ملاقات	اسلامی معاشرہ میں ملاقات کے آداب و مسائل
〃 〃 مسائلِ عیدین وقربانی	فطرہ، قربانی اور عقیقہ سے متعلق چھ سو (۶۰۰) مسائل
〃 〃 مسائلِ زکوٰۃ	زکوٰۃ کن مالوں میں اور کن لوگوں پر ہے؟ اس کے مسائل
〃 〃 مسائلِ سفر	آدابِ سفر اور مسائلِ نمازِ قصر اور متعلقہ مسائل
〃 〃 مسائلِ خفین	موزے اور زخم کی پٹی اور پلاسٹر پر مسح کے مسائل
مدلل مجموعہ خطبات ماثورہ	خطباتِ جمعہ، عیدین نیز نکاح اور خطبہ کے مسائل

ملنے کا پتہ

کتب خانہ حسینیہ دیوبند (یو۔پی)

مطبوعات کتب خانہ حسینیہ دیوبند یوپی

المعجم الوسیط	عربی ڈکشنری	300/-
القاموس الجدید	عربی اردو اضافہ شدہ	150/-
القاموس الجدید	اردو عربی اضافہ شدہ	175/-
القراۃ الواضحہ	جز اول	18/-
القراۃ الواضحہ	جز دوم	22/-
القراۃ الواضحہ	جز سوم	26/-
شرح القراۃ الواضحہ	جز اول	16/-
شرح القراۃ الواضحہ	جز دوم	20/-
شرح القراۃ الواضحہ	جز سوم	24/-
نحو قاسمی		40/-
توضیح المنطق		18/-
تفسیروں میں اسرائیلی روایات		70/-
اسلام اور جدت پسندی		30/-
اسالیب الانشاء	عربی ادب	20/-
المختارات الصحفیہ	عربی ادب	10/-
اکابر کے مجرب عملیات		10/-
مجموعہ القصص الادبیہ		75/-
ہمارے عائلی مسائل		40/-
شرح نفحۃ الادب		25/-
شرح دیوان متنبی		80/-
سیرۃ خاتم النبیین	(آسان عربی زبان میں)	54/-
معجم الحیی	(عربی سے عربی لغت)	150/-
خطوط نویسی	عربی، اردو، انگلش	75/-
جدید عربی ایسے بولئے	(اضافہ شدہ ایڈیشن)	50/-
بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرہ	عربی	50/-
میرے والد میرے شیخ		50/-
اسلام جدید معیشت و تجارت		50/-
ازالۃ الریب عن عقیدہ علم الغیب	اردو	160/-
(عقیدہ علم الغیب کا تحقیقی جائزہ)		
تسکین الصدور	اردو	140/-
احسن الفتاوی	۷ جلدیں	970/-
فضائل اعمال		45/-
پیارے رسولؐ کی پیاری غذائیں		25/-

فہرست کتب مفت طلب فرمائیں۔

فنِ اسماء الرجال

تالیف: ـــــــــ اسیر ادروی

- فنِ اسماء الرجال کی ضرورت
- فنِ اسماء الرجال کا تدریجی ارتقاء
- حدیث کے اخذ و قبول میں محدثین اور خود صحابۂ کرام کا معیارِ تحقیق
- حفاظتِ حدیث میں صحابہ کا معمول
- تحقیقِ روایات کی خاطر علماء کی بے مثال قربانیاں
- مشاہیرِ فنِ اسماء الرجال اور ائمۂ جرح و تعدیل کے حالات
- طلبہ اور اساتذۂ عربی مدارس کے لیے مفید اور کارآمد کتاب

کتابت و طباعت اعلیٰ، فوٹو آفسیٹ قیمت ۳۰/- روپے صفحات ۱۶۸
سائز $\frac{۱۸ \times ۲۲}{۸}$

تاریخ طبری کا تحقیقی جائزہ

تالیف: ـــــــــ اسیر ادروی

- تاریخِ طبری علم و تحقیق کی کسوٹی پر
- طبری کے مآخذ
- طبری میں مذکور بہت سے مجروح و ناقابلِ اعتبار راویوں کی فہرست مع حالات
- صحابۂ کرام کی ذات پر تنقید کرنے والوں کے لیے تازیانۂ عبرت
- ابنِ جریر طبری کے حالات اور کارناموں کی سرگزشت
- راویوں کے درجات، الفاظِ جرح و تعدیل اور اُن کے معانی و مفاہیم پر ایک سیر حاصل بحث

کتابت و طباعت معیاری۔ فوٹو آفسیٹ، قیمت ۲۰/- روپے
صفحات ۱۲۸ $\frac{۱۸ \times ۲۲}{۸}$

انقلابِ توحید

تالیف: ـــــــ مولانا محفوظ الرحمٰن شاہین جمالی

- پوری دُنیا پر اسلامی توحید کے انقلاب آفریں اثرات کا علمی و تاریخی مطالعہ
- کُتبِ سابقہ میں توحید کا بیان
- توحیدِ اسلامی کا امتیاز
- انقلابِ توحید کا خدائی اہتمام
- حقائقِ کائنات سے توحید کے دلائل
- مختلف زبانوں میں اللہ کا نام
- توحید کے دینوی ثمرات
- سائنس توحید کی راہ پر

کتابت و طباعت عمدہ، فوٹو آفسیٹ

قیمت =/۱۶ روپے، صفحات ۸۰ $\frac{۱۸ \times ۲۲}{۸}$

دارالمؤلفین دیوبند

حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی رح کی اہم تصانیف

القاموس الجدید اردو عربی ۱۷۵/-	جواہر المعارف جلد اول ۱۲۰/-
القاموس الجدید عربی اردو ۱۵۰/-	شرح القراۃ الواضحہ جز اول ۱۶/-
القاموس الاصطلاحی اردو عربی ۶۰/-	شرح القراۃ الواضحہ جز ثانی ۲۰/-
القاموس الاصطلاحی عربی اردو ۷۰/-	شرح القراۃ الواضحہ جز ثالث ۲۴/-
القراۃ الواضحہ جز اول ۱۸/-	نفحۃ الادب ۲۵/-
القراۃ الواضحہ جز ثانی ۲۲/-	شرح نفحۃ الادب ۲۵/-
القراۃ الواضحہ جز ثالث ۲۶/-	القاموس الوحید عربی اردو ڈکشنری زیر طبع

کتب خانہ حسینیہ دیوبند۔یوپی

PRINT ART Delhi Ph. : 7534222, Res. : 7522183